مجلسِ مولدِ نبوی (صلعم)

احادیث ضعیفہ و موضوعہ

سوال از جناب احمد حسین خاں صاحب۔ بی۔ اے

چند دنوں کے بعد ماہ مبارک ربیع الاوّل آنے والا ہے، جبکہ مولود شریف کی مجلسیں جابجا منعقد ہوں گی۔ لیکن جس طریقہ سے یہ مجلسیں منعقد ہوتی ہیں اور جو حالات و واقعات اس میں بیان کئے جاتے ہیں، معلوم نہیں جناب کا خیال اس بارہ میں کیا ہے؟ لیکن میں تو اس کو نہایت افسوسناک سمجھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ یہی حالات و واقعات ہیں جنھوں نے حضرت بانیٔ اسلام کی پاک زندگی کے متعلق مخالفین کے دلوں میں شکوک پیدا کر دئے ہیں۔

ایک مدت سے میرا خیال تھا کہ ایک مختصر رسالہ حضرت کے حالات میں جمع کروں جسکو مولود شریف کی مجلسوں میں پڑھا جائے، لیکن جس طرح کے حالات کا متلاشی تھا، وہ کہیں نہیں ملتے تھے۔ عرصہ ہوا ایک رسالہ منشی امیر احمد امیر مینائی نے شائع کیا تھا اور لکھا تھا کہ اس میں حالات زندگی ایک بہت بڑے عالم کی مدد سے لکھے گئے ہیں، لیکن اسکو بھی دیکھا، از سرتا پا وہی قصے بھرے تھے۔

اس سال میں نے بطور مسودے کے ایک تحریر لکھی اور چند علمائے دین کو بغرض اصلاح سنائی لیکن وہ اس [illegible] نہایت برہم و ناراض ہوئے کہ ذکر ولادت کے وہ واقعات اس [illegible] جو عام [illegible] مولود میں بیان کئے گئے ہیں۔ میں نے انہیں

... صاحب تصنیف عالم صاحب سے عرض کیا کہ کیا یہ واقعات مستند تاریخوں اور کتابوں میں لکھے ہیں؟ انھوں نے جواب میں لکھا کہ "یہ تمام واقعات و معجزات صحیح ہیں جن کو تمام مؤرخین و محدثین نے ہمیشہ بیان کیا ہے۔ بڑے بڑے علمائے دین اور اکابر اسلام نے اُن کی تصدیق فرمائی ہے، اور ان کو پڑھا ہے اور مجلسوں میں سُنا ہے۔ البتہ آج کل کے نیچریوں اور لا مذہبوں کو انکے ماننے میں تامل ہے، کیونکہ انگریزی کی کتابوں میں مرقوم نہیں۔"

آپ ہمیشہ ہم انگریزی دانوں کو الحاد اور مذہبی غفلت کا الزام دیتے ہیں لیکن جس انداز اور طریقہ سے دیتے ہیں، اُس کی وجہ سے ہم نہایت خوش ہیں اور آپ کو اپنا خیر خواہ اور مصلح سمجھتے ہیں، لیکن خدا کے لئے اس بارے میں میری تشفی کر دیجئے کہ آیا یہ واقعات واقعی مستند کتابوں میں مرقوم ہیں؟ اور ان میں شک کرنا نیچریت اور مذہب سے کنارہ کشی ہے؟ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو انصاف کیجئے کہ کیا یہ واقعات عقل میں آتے ہیں؟ اور ان کو آجکل کوئی تسلیم کر سکتا ہے؟ معاف فرمائیے گا اگر ایسے ہی واقعات سُنا کر آپ ہم کو دینی جذبات سے برگشتگی کا الزام دیتے ہیں، تو دیکھئے، ہماری سمجھ میں تو نہیں آتے۔ وہ واقعات یہ ہیں :۔

(۱) جب حضرت کی ولادت کا وقت قریب آیا تو ایک مرغ سفید نمودار ہوا اور حضرت آمنہ کے پاس آیا، نیز اُس شب کو تمام جانوروں اور پرندوں نے گفتگو کی۔

(۲) حضرت مریم اور حضرت آسیہ کا ولادت سے پہلے آنا اور بشارت دینا

(۳) جب حضرت عبداللہ کا نکاح حضرت آمنہ سے ہوا تو دو سو عورتیں رشک سے مرگئیں۔

(۴) حضرت کی ولادت کے دن آتشکدۂ ایران بجھ گیا، قصر نوشیرواں کے

نگورے گر گئے اور خانہ کعبہ کے بُت اوندھے ہو گئے۔

(۵) ولادت کے بعد حضرت کچھ دیر کے لئے غائب ہو گئے اور پھر کسی نے بہشتی کپڑوں میں لاکر رکھدیا۔

(۶) روشنیوں کا نمودار ہونا اور عجیب عجیب آوازوں کا سُنائی دینا۔

جواب

منجانب حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد

آپ کا جوش دینی، و محبت ایمانی، و فکر اصلاح مجالس ذکر مولد، مستحق تحسین و لائق تشکر ہے۔ فجزاکم اللہ تعالیٰ۔

آپ نے ایک نہایت اہم اور ضروری بحث چھیڑ دی۔ جی چاہتا ہے کہ بلا تامل صفحے کے صفحے لکھ جاؤں، لیکن افسوس کہ وقت اور گنجائش سے مجبور ہوں، لہذا چند کلمات ضروریہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

فضیلت مجالس ذکر (صلعم)

مولود کی مجالس کا عجیب حال ہے۔ مقصد مجلس کے لحاظ سے دیکھئے تو فقیر کے اعتقاد میں اس سے زیادہ اہم، عظیم المنفعت، اور قوم کے لیے ذریعۂ ارشاد و ہدایت اور کوئی اجتماع نہیں۔ لیکن طریق انعقاد پر نظر ڈالیے تو اجتماعی و مجلسی قوتوں کے ضائع کرنے کی بھی اس سے زیادہ اور کوئی افسوسناک مثال نہیں ملیگی۔ اسلام ایک تعلیم تھی، اور اس تعلیم کا عملی نمونہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کہ:-

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم	بیشک رسول اللہ کی زندگی میں اُن لوگوں کے لئے پیروی اور اتباع کا ایک بہترین نمونہ ہے جو اللہ

الآخر و ذکر اللہ کثیراً ۔ (۳۳-۲۲)	اور یوم آخرت سے ڈرتے اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والے، اور بکثرت ذکر کرنے والے ہیں۔

حضرت (عائشہ) سے پوچھا گیا کہ اُس صاحبِ خُلقِ عظیم کا اخلاق کیا تھا؟ فرمایا:- خلقہ القرآن! اگر آنحضرت کا اخلاق دیکھنا ہے تو قرآن دیکھ لو کہ اس "کتاب مرقوم" کا وہ ایک ظلِ مجسّم، اور اسکے عملی نمونہ کی ایک "لوح محفوظ" ہے! وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون۔ (۸۳-۱۸) لہ

پس مولود کی مجلسوں کا اصلی مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ اس "اسوۂ حسنہ" کے جمال الٰہی کی تجلی گاہ ہوتیں، آں حضرت کے صحیح حالات زندگی سُنائے جاتے، انکے اخلاق عظیمہ اور خصائل کریمہ کے اتباع کی لوگوں کو دعوت دی جاتی، اور اُن اعمال کا دلوں میں شوق و ولولہ پیدا کیا جاتا، جو ایک "مسلم و مؤمن" زندگی کے کیرکٹر کا اصلی مایۂ خمیر ہیں، اور جن کے اتباع نے صحابۂ کرام کی زندگی کو اس درجہ تک پہنچا دیا تھا کہ لسانِ الٰہی نے "یحبھم و یحبونہ" کے صدائے محبت سے انکی مدح سرائی کی اور اتباعِ محبوب نے ان کو خود محبوب بنا دیا۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ و یغفر لکم ذنوبکم واللہ غفور الرحیم (۳-ع ۴)	اے پیغمبر! مدعیان محبت الٰہی سے کہدو کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو (اگر تم نے ایسا کیا تو تم کو اللہ کی محبت کے دعوے کی ضرورت نہو گی بلکہ) خود اللہ تم کو اپنا محبوب بنا لیگا اور تمھارے گناہوں کو بھی بخشدیگا، وہ نہایت مہربان بخشنے والا ہے

اگر ایسا ہوتا تو ظاہر ہے کہ ان مجالس سے بڑھکر مسلمانوں کے لیے سعادت کونین کا ذریعہ اور کیا تھا؟ یہ تمام کانفرنسیں اور انجمنیں جن کا چاروں طرف ہنگامہ بپا ہے، ایک طرف، اور اُس مجلس کا ایک لمحہ ایک طرف، جو اس "اسوۂ حسنہ" کے نظارے

لہ یہ چیز ہے کہ پیروی کرنے والوں کو اسکی پیروی کرنی چاہیے۔

میں بسر ہو۔ ہماری مجلسیں اسی ذکر کے لئے ہونی چاہئیں، اور ہماری آنکھیں اسی جمال جہاں آرا کے نظارے کے لئے۔

خدا سر دے تو سودا دے ترے زلفِ پریشاں کا

ولنعم ما قیل

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خمِ طرۂ یارے گیرند!

لیکن بدبختی یہ ہے کہ ہمارے اعمال کی صورتیں مسخ نہیں ہوئی ہیں، مگر حقیقت غارت ہو گئی ہے، قومی تنزّل کے معنی یہی ہیں کہ تمام قومی و دینی اشغال بظاہر قائم رہتے ہیں لیکن ان کی روح مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہماری مسجدیں اُجڑ گئی ہوں، کتنے جھاڑ اور فانوس ہیں جن سے مسجدیں بقعۂ نور بنائی جاتی ہیں؟ مگر رونا یہ ہے کہ دل اُجڑ گئے ہیں، اور یہ وہ بستی ہے کہ جب یہ ویران ہو جائے تو پھر آبادی کہاں؟

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

فانہا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور!

مجھے کیا کہنا تھا، اور کیا کہنے لگا۔ بہرحال مولود کی مجلسیں بھی اپنے مقصد کے لحاظ سے ایک بہترین دینی عمل تھا، جسکی صورت تو قائم ہے، مگر حقیقت مفقود محض ایک رسمی تقریب ہے جو مثل اور رسمی صحبتوں کے ضروری سمجھ لی گئی ہے اور اُمراء و رؤسا نے تو اپنی نمائش اور ریائے دولت کا اس کو بھی ایک ذریعہ بنا لیا ہے۔

آں حضرت کے صحیح حالاتِ زندگی اور اُن انقلاباتِ عظیمہ کے بیان کی جگہ

(جو آپ کی ولادت کے واقعہ نے مشرق و مغرب میں پیدا کر دیے) کتنے افسوس کی بات ہے کہ محض چند روایات ضعیفہ و قصص موضوعہ کے بیان کرنے پر اتنے بڑے ملی و دینی جذبے کو قربان کر دیا جاتا ہے؟ اور پھر اگر محض طبقۂ عوام کا یہ حال ہو تو قابل شکایت نہیں، لیکن تعجب اور صد ہزار تعجب ہے اس بوالعجبی پر، کہ صد ہا علمائے ملت ہیں جو باوجود ادعائے رسوخ حدیث و سیر، و وسعت نظر و عام، ان روایات کو خاموشی کے ساتھ سنتے ہیں، خود پڑھتے ہیں، اور لوگوں سے پڑھواتے ہیں، مگر ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے دل میں تحقیق و تفتیش جنبش پیدا نہیں ہوتی۔

ان ھذا من اعاجیب الزمن!

کاش جسقدر بحث نفس انعقاد اور مجلس کے سنت و بدعت ہونے کی نسبت کی گئی ہے، وہ اس مجلس کی اصلاح حال کے لیئے کی جاتی۔ وہ تمام چیزیں جو قوم میں شوق و شغف کے ساتھ موجود ہوں، درحقیقت ایک قوت ہیں، پس سب سے اول کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اسٹیم کو ضائع کرنے کی جگہ اس سے مفید کام لیا جائے۔ البتہ اگر اصل کار ہی جادۂ شریعت سے منحرف ہو اور صورت اصلاح مفقود، تو پھر اسکے استیصال کی کوشش امر بالمعروف میں داخل اور ناگزیر ہے۔

غفلت و مداہنت علماء و تشدد بے محل

ہزار تعجب ہے اُس عالم صاحب تصنیف و تالیف کے دعوئے علم پر، جسکے جواب کے بعض جملوں کو آپ نے نقل کیا ہے۔ درحقیقت یہی وہ مذہب کے نادان حامی ہیں، جن کی دوستانہ حمایت، ہمیشہ دشمنوں کی

مخالفت سے زیادہ مذہب کے لیۓ مضر رہی ہے۔ جن روایات کی نسبت آپ نے تحقیق چاہی تھی، اُن کا انکار نہ تو نیچریت ہے اور نہ الحاد، بلکہ عین شیوۂ اسلام وایمان ہے۔ اور ہر صاحب نظر، جسکو فن حدیث وسیر سے کچھ بھی خبر ہوگی، ایک لمحہ کے لیۓ بھی ان روایات کو تسلیم نہیں کریگا۔

آپ اس سعی وکوشش کے لۓ مستحق تحسین تھے، افسوس کہ اس نادان مدعی علم نے تشدد مذہبی کا بیجا استعمال کیا، حالانکہ جو محل استعمال ہیں، انکی ہمارے علماء خبر بھی نہیں لیتے۔

بہت سے لوگ ہیں جو تشدد مذہبی اور تعصب دینی کو علماۓ حال کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور پھر برسوں سے اسیر رور ہے ہیں، لیکن میں اُسے صحیح نہیں سمجھتا۔ مجکو تو شکایت ہے کہ جس درجہ تشدد مذہبی علماء میں ہونا چاہیے افسوس ہے کہ نہیں ہے۔ صدہا امور ایسے ہیں جن میں صاف طور پر انکے بیجا تسامح و مداہنت کو دیکھ رہا ہوں اور حق ومعروف کے اعلان سے دانستہ اعراض کیا جارہا ہے۔ البتہ چند چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن میں تشدد کا اظہار ہوتا ہے، مگر چونکہ یہ اظہار بے محل ہوتا ہے، اسلیۓ محض رائگاں جاتا ہے بلکہ اکثر موقعوں میں اور مضر ہوتا ہے۔

ایک بہت بڑا نکتۂ عمل یہ ہے کہ ہر قوت کا استعمال اسکے صحیح محل میں ہو۔ آپ اسٹیم کو جس سے سمندروں میں جہاز، خشکیوں پر ریل، اور کارخانوں میں مشینیں چلتی ہیں، ٹاٹ کی بوریوں میں بھرکر غبارہ بنانے کی کوشش نہ کیجیے ورنہ آپ کی قوت اور سعی دونوں رائگاں جائیں گی۔

یہ اس ذکر کے چھیڑنے کا وقت نہیں، ورنہ بجاۓ خود ایک داستان طولانی ہے۔ اپنی مصیبتوں کا حال یہ ہے کہ چادر کا کوئی گوشہ دبتے سے

خالی نہیں کس کس چیز کو بیان کیجیے، کس کس کے حال پر روئیے، اور پھر اتنا وقت کہاں سے لائیے؟

آسودہ شبے باید و خوش مہتابے　　تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

معیارِ تصدیق و تغلیط و اصولِ نقدِ روایت

لیکن ان روایات کی صحت و عدمِ صحت کی نسبت ضمناً جن خیالات کا آپ نے اظہار فرمایا ہے، افسوس کہ فقیر اس سے متفق نہیں۔ وہ ایک نہایت خطرناک اصولی غلطی ہے، جس میں زمانۂ حال کے مدعیانِ تحقیق و اجتہاد اور رہروانِ جادۂ تطبیق عقل و نقل، برسوں سے مبتلا ہیں۔ آپ نے بار بار اس سوال کو دہرایا ہے کہ "اگر یہ روایات صحیح ہیں تو کیا عقل میں آسکتی ہیں؟" جواباً گذارش ہے کہ روایات تو یقیناً صحیح نہیں ہیں، لیکن یہ اصول بھی کب صحیح ہے کہ جو واقعہ آپ کی عقل میں نہ آئے، وہ یکسر غلط و موضوع ہے؟

آپ بلا تامل پوچھئے کہ یہ واقعات اصولِ فنِ روایت کی بنا پر کہاں تک صحیح اور قابلِ قبول ہیں؟ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ صرف اتنا پوچھ لینا ہی آپ کے مقصد کے حصول کے لئے کافی ہے، لیکن یہ کہاں کا اصول تحقیق اور معیارِ تمیز حق و باطل ہے کہ واقعہ کی صحت کے لئے پہلی شرط آپ کے عقل کی تصدیق ہے؟ آپ لوگ آج کل بے تکلف یہ جملہ کہہ دیا کرتے ہیں مگر نہیں سمجھتے کہ کیسی خطرناک سوفسطائیت کی راہ ہے، جو اس طرح آپ کے سامنے کھل جاتی ہے۔ ہر واقعہ کی صحت و عدمِ صحت کے لئے پہلی چیز اصولِ روایت اور صحتِ نقل کے شرائط کا اجتماع ہے اور بس، نہ کہ زید و عمر کی عقل میں آنا۔ مجھکو یقین نہیں کہ مارکونی ٹیلی گرام کو آپ کی عقل تسلیم کرتی ہو، اور تھا گیا آپ نے اب تک

اسکا عینی مشاہدہ بھی نہ کیا ہوگا، لیکن اوّل مرتبہ جب اس ایجاد کی خبر یورپ کے کسی مستند پرچے میں دیکھی ہوگی، اور تمام اخباروں میں اسکی شہرت کا غلغلہ مچا ہوگا، تو فرمائیے، آپ نے اسکی تصدیق کی تھی یا انکار؟

آپ کو معلوم نہیں کہ یہی وہ سرحد ہے جہاں سے (باوجود اتحاد مقصد و اصول) مجھے آجکل کے مصلحین مذہب سے الگ ہوجانا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ جس حدیث اور جس روایت کو اپنے خود ساختہ معیار عقلی سے ذرا بھی الگ پاتے ہیں، معًا اس سے انکار کردینے کے لئے بیچین ہوجاتے ہیں، اور پھر اس انکار محض کو "تطبیق منقول و معقول" کے مرعوب کن لفظ سے تعبیر کرنے کے علانیہ تمسخر سے نہیں شرماتے وتقولون بافواھکم ما لیس لکم بہ علم، وتحسبونہ ھینًا وھو عند اللہ عظیم (۲۴-۱۵)

حالانکہ اگر ان کو علوم دینیہ کے حصول کا موقعہ ملا ہوتا اور علم وفن پر نظر ہوتی، تو وہ دیکھتے کہ اسی مقصد کو اصولِ فن کے ساتھ چلکر بھی حاصل کرسکتے ہیں۔

کیا ضرورت ہے اسکی کہ ان روایات کی محض اس وجہ سے تغلیط کردی جائے کہ وہ ہماری عقل میں نہیں آتیں، جبکہ ہم اصول مقررہ حدیث و آثار، وطریق جرح و تعدیل روایت، و تحقیق و نقد درایت، و شہادت موثقہ ارباب علم وفن کی بنا پر بغیر ادنیٰ دقت کے ثابت کرسکتے ہیں کہ یہ روایات ہی پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں، اور اصول فن سے لائق احتجاج نہیں۔ اور اس طرح بغیر سر رشتۂ اصول کو ہاتھ سے دیے، اُسی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

معلوم نہیں آپ نے میری گذارش کو سمجھا بھی یا نہیں؟ میں کہتا ہوں کہ بہت سی باتیں ہیں جن سے انکار کرنے میں ممکن ہے کہ آپ کے مصلحین حالی اور ہم متفق ہوں، لیکن پھر ہم میں اور ان میں بعد المشرقین ہے۔ وہ محض اس

بنا پر انکار کرتے ہیں کہ ان کی عقل میں نہیں آتی، اور ہم اس لیے انکار کرتے ہیں کہ اصولِ فن سے ان کا قابلِ تسلیم ہونا ثابت نہیں فای الفریقین احق بالامن ان کنتم تعلمون؟

آپ کہیں گے کہ نتیجہ دونوں کا ایک ہے، میں کہونگا کہ منزل تک پہنچنے ہی پر سفر کی کامیابی موقوف نہیں ہے، بلکہ بہت کچھ راہِ سفر کے تعین و انتخاب پر۔

وشتان ما بین خلّ وخمر

آپ کو نہیں معلوم، صدہا باتیں ہیں کہ آجکل کے مصلحین بھی کہتے ہیں اور انہی کو امام غزالی اور شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہما نے بھی کہا ہے، مگر پھر دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک سے الحاد پرورش پاتا ہے اور دوسرے سے مذہب کو تقویت ہوتی ہے، حالانکہ مقصود پہلی جماعت کا بھی تقویت مذہب ہی ہے۔ یہ فرق حالت بھی زیادہ تر اسی اختلاف طریق کا نتیجہ ہے۔ آپ لوگوں کو شکایت ہے کہ علما آجکل کی چیزوں پر متوجہ نہیں ہوتے۔ یہ سچ ہے، مگر اسکو بھی تو دیکھئے کہ آپ لوگوں نے ان کی نظروں کو متوجہ کرنے ہی کا کونسا سامان کیا ہے؟ لوگ دیکھتے ہیں کہ جس چیز کو آپ "تطبیق عقل و نقل" کہتے ہیں، وہ صرف ایک تیز و برق خرام قینچی ہے، جسکو آپ نے اُٹھایا اور بے تکان قطع و بُرید شروع کردی۔ نہ علم و فن سے مس ہے، نہ اصول و قواعد کی خبر ہے، نہ کتابوں پر نظر ہے، اور نہ اُس زبان سے واقفیت ہے، جس سے قرآن و حدیث کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر وہ آپکی وقعت کریں تو کیا کریں؟

گو میں اپنے عقیدے میں اس اغماض کو بھی علما کی ایک سخت غلطی سمجھتا ہوں اور بیانِ وجوہ کا یہ موقع نہیں، تاہم اگر وہ اپنے اغماض کی یہ توجیہ کریں تو آپ کیا جواب دیں گے؟

میں جو ہمیشہ (شیخ محمد عبدہ) اور ان کے متبع طریقت (سید رشید رضا) کی تعریف کرتا ہوں تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بہ نسبت ہندوستان کے مصلحین جدید کے اس نکتے کا زیادہ خیال رکھا ہے، حالانکہ ضرورت ان کے سامنے بھی وہی تھی جو یہاں درپیش ہے۔

اب اپنے سوالات کا جواب لیں۔ عقل و تفلسف کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں، سرے سے یہ تمام روایتیں ہی از قبیل قصص و حکایات موضوعہ ہیں، جن کا کتب معتبرۂ حدیث میں نام و نشان تک نہیں۔

طبقۂ محدّثین و جماعتِ قصّاص و وعّاظ

اس تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں مگر چند الفاظ کہونگا۔ یہ کیسی سخت بدبختی کی بات ہے کہ آج مسلمانوں میں جن چیزوں کی سب سے زیادہ شہرت، اور عوام و خواص میں جو بیانات سب سے زیادہ مقبول ہیں، وہی سب سے زیادہ غیر معتبر اور ناقابل تسلیم بھی ہیں۔ یہ حال ہر علم و فن کا ہے۔ تاریخ میں وہی کتابیں اور انہی کتابوں کی حکایات مشہور و مقبول ہیں، جنکے بعد ہمارے یہاں خرافات و اکاذیب کا کوئی درجہ نہیں۔ سیر و فضائل میں بھی انہی کتابوں کو قبول عام حاصل ہے، جنکے مصنف محدّثین کی جگہ قصّاص و واعظین تھے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ قدماء کی کتابوں پر نظر نہیں، اور ہر علم و فن میں تمام دار و مدار متاخرین پر ہے۔ یہ لوگ محض حاطب اللیل تھے، اور چند کتابوں سے رطب و یابس روایات کو کسی ترتیب تازہ کے ساتھ جمع کردینا ہی ان کی قوت تصنیف کا سدرۃ المنتہیٰ تھا۔

میں نے دو مرتبہ "قصّاص و واعظین" کا لفظ کہا، یعنی مذہبی قصص و حکایات

سے گرمیِ محفل کا کام لینے والے واعظ۔ فی الحقیقت یہ طبقہ ہمارے یہاں ابتدا سے سرچشمۂ موضوعات، و مبدء جمیع اقسام افترا و مکذوبات، و ینبوع خرافات و حکایات رہا ہے۔ یہ لوگ اپنے وعظ و بیانات کو انظار عوام میں دل فریب و پرکشش بنانے کے لئے مجبور تھے کہ قصص و حکایات کی تلاش و جستجو میں رہیں، اور اگر میسّر نہ آئیں تو خود وضع کریں یکتبون بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ پھر یہ لوگ اسی طرح کی تمام روایتوں کو شاعرانہ اغراق و تغلیب، اور داستان طرازانہ اضافہ و تحشیہ کے ساتھ اپنی مجلسوں میں بیان کرتے تھے، اور رفتہ رفتہ مرض متعدی ہو جاتا تھا۔ علی الخصوص متاخرین ایران میں بعض لوگوں نے وعظ گوئی کو ایک مستقل فن بنا دیا، اور چونکہ قابل اور اہلِ علم بھی تھے، اسلئے اپنی مجالس کو کتب سیر و قصص کی صورت میں مدوّن بھی کر دیا۔ ضلوا فاضلوا، فویل لھم و لاتباعھم۔

مثلاً (ملا حسین واعظ کاشفی) اور (ملا معین الدین ہروی) انہی لوگوں میں سے تھے۔ علی الخصوص آخرالذکر شخص، جو فی الحقیقت انشا پردازی، و حکایت طرازی، و اقتباس روایات ضعیفہ و موضوعہ، و تاویلات رکیکۂ قرآن و سنّت، و عبور و رسوخ اسرائیلیات و روایات یہود میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

شاید بہت سے لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ آج اردو زبان میں جس قدر مولود لکھے گئے ہیں اور رائج ہیں، وہ سب کے سب بے واسطہ یا بالواسطہ اسی (ملا معین ہروی) کی کتابوں۔ معارج النبوہ، تفسیر سورۂ یوسف موسوم بہ نقرہ کار، قصۂ حضرت موسیٰ علیہ السّلام موسوم بہ اعجاز موسوی وغیرہا سے ماخوذ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان کتابوں میں بعض حصے نہایت دلچسپ اور قابلِ دید ہیں، مثلاً وہ صوفیانہ و عارفانہ لطائف و نکات آیات و احادیث جو اقوال

و مرویات صوفیا سے لئے گئے ہیں، یا خود اس نے پیدا کئے ہیں، لیکن تاہم ان لطائف کو کیا کیجئے کہ اصل موضوع ہی سرتاسر ینبوع خرافات ہے۔

یہ لوگ ان میں سے اکثر چیزوں کے خود موجد نہ تھے، بلکہ اپنی جماعت کے پیشرو افراد کے متبع، لیکن فارسی میں لکھ کر اور کتب مجالس و وعظ کو شائع کر کے ان لوگوں نے تمام موضوعات و خرافات کو ایران و ہند میں پھیلا دیا، اور چونکہ عوام بالطبع اس غذا کے خواہاں ہیں، بغیر کسی دقت کے ان کو قبول عام حاصل بھی ہو گیا۔ والقصۃ بطولہا۔

قصص کتب مولد کا سرچشمۂ اوّل

آپ نے جن روایات کی نسبت استفسار کیا ہے، (آپ کو سنکر تعجب ہوگا کہ) ان میں سے ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے، جو اصول فن حدیث کی بنا پر صحیح تسلیم کیا جا سکے، اور جسکو کتب معتبرہ محدثین میں روایت کیا گیا ہو۔ (صحاح ان قصص سے خالی ہے۔ عام مسانید و معاجم اور مصنفات مشہورہ میں بھی کوئی لائق احتجاج ثبوت نہیں ملتا۔ حافظ (سیوطی) نے (جمع الجوامع) میں جمع احادیث کا پورا التزام کیا ہے، لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان روایات کا اس میں کہیں پتہ نہیں! (کنز العمال میں متعدد ابواب تھے جہاں یہ روایات آ سکتی تھیں۔ مثلاً (معجزات من قسم الاقوال) کے باب (اعلام و دلائل نبوت) میں لیکن ایک اثر بھی وہاں درج نہیں کیا گیا۔ (قسم الافعال) میں ولادت کا مستقل باب موجود ہے، مگر وہ نہایت مختصر ہے اور صرف چند آثار، تاریخ و ایام ولادت کے متعلق پائے جاتے ہیں لیکن ان واقعات کا کہیں ذکر نہیں۔ معجزات ولادت میں صرف دو چار روایتیں آنحضرت کے مختون پیدا ہونے کی نسبت البتہ

درج کی ہیں، لیکن وہ تمامتر (ابن عساکر) کی ہیں، جنکی نسبت علامہ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ " وفیھا احادیث کثیرۃ ضعیفۃ موضوعۃ وھینۃ " اور پھر ان سب کے راوی اوّل حضرت ابن عباس ہیں، اور اس لئے تمام روایات ولادت کی طرح یہ روایت بھی منقطع ہے، پس قابل احتجاج نہیں۔

(ان روایات کے لئے کنز العمال جلد ۲۔ صفحہ ۳۳۱ کو دیکھئے)

کنز العمال کے باب (قسم الافعال) میں (دلائل و اعمال نبوت) کے عنوان کے نیچے دو تین طول طویل روائتیں (ابن عساکر) وغیرہ سے لیکر درج کی ہیں، جن میں نہایت بے سرو پا قصے بیان کئے ہیں اور یقیناً یکسر موضوع ہیں، تاہم ان میں بھی ان واقعات ولادت کا کہیں پتہ نہیں (ایضاً۔ صفحہ ۳۰۴)

روایات ثلاثہ حافظ ابونعیم اصفہانی

پس دراصل ان قصص کا سرچشمۂ وحید، اور مبدء اوّل وہ تین طول طویل حدیثیں ہیں، جن کو (ابونعیم) صاحب (دلائل) نے عمرو بن قتیبہ، ابن عباس، اور خود حضرت عباس کی نسبت سے روایت کیا ہے، اور یہی روایات ہیں، جن کا آگے چل کر قصاص و مجلس آرا واعظوں نے اپنی گرمیِ مجلس کیلئے استقبال کیا اور پھر تمام قصص و حکایات اور کتب سیر متاخرین میں داخل ہوگئیں؟

شیخ جلال الدین سیوطی نے (خصائص کبریٰ) کی پہلی جلد میں ان تینوں روایتوں کو نقل کیا ہے۔ ان میں سے ہر روایت ایک ایک صفحہ کی ہے پوری نقل نہیں کر سکتے، ضروری ٹکڑے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) بروایت قتیبہ

واخرج ابونعیم عن عمرو بن قتیبۃ، قال سمعت ابی وکان مزادعیۃ العلم قال۔ لما حضرت ولادۃ آمنۃ قال اللہ للملائکۃ افتحوا ابواب

السماء کلها وابواب الجنان کلها، وامر الله الملائکة بالحضور، فنزلت تبشر بعضها بعضًا وتطاولت جبال الدنیا وارتفعت البحار وتباشر اهلها، فلم یبق ملک الاحضر، واخذ الشیطان فغل سبعین غلًا، والقی منکوسًا فی لجة البحر الخضراء، وغلت الشیاطین والمردة، والبست الشمس یومئذ نورًا عظیمًا، واقیم علی رأسها سبعون الف حوراء فی الهواء ینتظرون ولادة محمد صلی الله علیه وسلم، وکان قد اذن الله تلک السنة لنساء الدنیا ان یحملن ذکورًا کرامة لمحمد صلی الله علیه وسلم، وان لا تبقی شجرة الاحملت ولا خوف الاعاد امنًا۔ فلما ولد النبی صلی الله علیه وسلم امتلأت الدنیا کلها نورًا وتباشرت الملائکة وضرب فی کل سماء عمود من زبرجد وعمود من یاقوت قد استنار به، فهی معروفة فی السماء۔ ونکست الاصنام کلها واما اللات والعزّی، فانهما اخرجا من خزانتهما وهما یقولان "ویح قریش جاءهم الامین جاءهم الصدیق"

(۲) بروایت ابن عباسؓ

واخرج ابو نعیم عن ابن عباس قال:- کان من دلالات حمل رسول الله صلی الله علیه وسلم ان کل دابة کانت لقریش نطقت تلک اللیلة ⁘ ⁘ ⁘ ولم تبق کاهنة فی قریش ولا فی قبیلة من قبائل العرب، الا حجبت عن صاحبتها، وانتزع علم الکهنة منها، ولم یبق سریر ملک من ملوک الدنیا الا اصبح منکوسا، والملک مخرسا لا ینطق یومه ذلک ومرت وحش المشرق الی وحش المغرب بالبشارات ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ونفتح الله لمولده ابواب السماء وجنانه فکانت اٰمنة تحدث عن نفسها

وتقول "اتانی آتٍ حین مرّ بی من حملہ ستۃ اشہر فرکزنی برجلہ فی المنام
وقال لی یا آمنۃ! انک قد حملت بخیر العالمین طرًّا فاذا ولدتیہ
فسمیہ محمدا" فکانت تحدث عن نفاسہا وتقول "لقد اخذنی ما
یاخذ النساء ولم یعلم بی احد من القوم فسمعت وجبۃ شدیدۃ و
امرا عظیما، فہالنی ذلک، فرایت کان جناح طیر ابیض قد مسح
علی فوادی فذھب عنی کل رعب وکل وجع کنت اجد ثم التفت فاذا
انا بشربۃ بیضاء لبنا وکنت عطشی، فتناولتہا شربتہا فاضاء منی
نور عال، ثم رایت نسوۃ کالنخل الطوال، کانہن من بنات عبد مناف
یحدقن بی، فبینا انا اعجب اذا بدیباج ابیض قد مد بین السماء و
الارض، واذا بقائل یقول خذوا من اعین الناس۔ قالت ورأیت
رجالاً قد وقفوا فی الھواء بایدیھم اباریق فضۃ، ورایت قطعۃ من
الطیر قد اقبلت حتی غطت حجری مناقیرھا من الزمرد واجنحتہا
من الیواقیت فکشف اللہ عن بصری وابصرت تلک الساعۃ مشارق
الارض ومغاربھا ۔۔۔ ثم رایت سحابۃ بیضاء قد اقبلت من السماء
حتی غشیتہ فغیب عن وجھی وسمعت منادیا ینادی "طوفوا بمحمد
شرق الارض وغربھا وادخلوہ البحار لیعرفوہ باسمہ ونعتہ وصورتہ"
۔۔۔ ثم تجلت عنہ فی اسرع وقت فاذا انا بہ مدرج فی ثوب صوف
ابیض وتحتہ حریرۃ خضراء وقد قبض علی ثلاثۃ مفاتیح من اللولؤ
الرطب واذا قائل یقول "قبض محمد علی مفاتیح النصرۃ ومفاتیح
الریح ومفاتیح النبوۃ" ثم اقبلت سحابۃ اخری یسمع منہا صھیل
الخیل وخفقان الاجنحۃ حتی غشیتہ فغیب عن عینی، فسمعت

منادیا ینادی "طوفوا بمحمد الشرق والغرب وعلی موالید النبیین واعرضوہ علی کل روحانی من الجن والانس والطیر والسباع۔"

٭ ٭ ٭ واذا انا بثلاثۃ نفر فی ید احدھم ابریق من فضۃ و فی ید الثانی طست من زمرد اخضر و فی ید الثالث حریرۃ بیضاء فنشرھا فاخرج منھا خاتما تحار ابصار الناظرین دونہ، فغسلہ من ذلک الابریق سبع مرات ثم ختم بین کتفیہ بالخاتم ولفہ فی الحریرۃ ثم حملہ فادخلہ بین اجنحتہ ساعۃ ثم ردہ الی"

(۳) بروایت حضرت عباس

واخرج ابونعیم بسند ضعیف عن العباس قال لما ولد اخی عبد اللہ وھو اصغرنا ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ فلما ولدت آمنۃ قلت لھا ما الذی رایت فی ولادتک؟ قالت "لما جاءنی الطلق واشتد بی الامر سمعت جلبۃ وکلاما لا یشبہ کلام الآدمیین ورایت علما من سندس علی قضیب من یاقوت قد ضرب ما بین السماء والارض ٭ ٭ ٭ ٭ ورایت قربی سربا من القطاء قد سجدت لہ ونشرت اجنحتھا ورایت تابعۃ سعیرۃ الاسدیۃ قد مرت وھی تقول مالقی الاصنام والکھان من ولدک ھذا اھلکت سعیرۃ والویل للاصنام ورایت شابا من اتم الناس طولا ما اشد ھم بیاضا، فاخذ المولود منی، فتفل فی فیہ، ومعہ طاس من ذھب فشق بطنہ شقا، ثم اخرج قلبہ فشقہ شقا، فاخرج منہ نکتۃ سوداء فرمی بھا، ثم اخرج صرۃ من حریر اخضر ففتحھا فاذا فیھا شیٔ کالذریرۃ البیضاء فحشاہ، ثم اخرج صرۃ من حریر

ابیض ففتحہا فاذا فیہا خاتم فضرب علیٰ کتفہ کالبیضۃ والبسہ قمیصًا"۔ فھذا ما رایت۔ [۱]

لیکن یہ تینوں روایتیں قطعًا بے اصل ہیں بوجوہ ذیل :-

(۱) حافظ (ابونعیم) پانچویں صدی کے حفاظ حدیث میں سے ہیں۔ (ذہبی) نے ان کو تیرھویں طبقہ کے ذیل میں شمار کیا ہے اور (تذکرہ) میں مفصّل ترجمہ لکھا ہے۔ ان کی جلالت مرتبت سے انکار نہیں، لیکن کیا کیجئے کہ یہ اُن لوگوں میں ہیں جنکی نسبت مسلم ہے کہ فضائل و معجزات میں رطب و یابس اور ضعیف و موضوع ہر طرح کی حدیثیں درج کر دیا کرتے تھے۔ یا تو یہ حسن اعتقاد کی وجہ سے تھا، یا پھر اعتمادًا علی الناس، کہ لوگ خود درجۂ صحت و ضعف کو تحقیق کر لینگے یہانتک کہ (علامۂ ابن تیمیہ) کو ابوالشیخ اصفہانی کے ذکر میں لکھنا پڑا :-

وفیہا احادیث کثیرۃ قویۃ صحیحۃ وحسنۃ واحادیث کثیرۃ ضعیفۃ وموضوعۃ ... وکذالک ما یرویہ ابونعیم فی فضائل الخلفاء فی کتاب مفرد فی اوّل حلیۃ الاولیاء (کتاب التوسل) ص۵	اور اس میں بہت سی حدیثیں ہیں جو قوی و حسن ہیں اور بہت سی ضعیف و موضوع ہیں۔ ... یہی حال اُن احادیث کا ہے جو ابونعیم نے خلفا کے فضائل میں بصورت ایک مستقل کتاب کے روایت کی ہیں (حلیۃ الاولیاء) کے ابتدا میں۔

علامۂ (ابن تیمیہ) کی شہادت پر شاید بعض پرستارانِ سبکی وابن حجر مکی

[۱] ہم نے ان تینوں روایتوں کا بہت سا حصہ چھوڑ دیا اور ترجمہ بھی نہیں کیا، کیونکہ اس سے مضمون بہت بڑھ جاتا اور الہلال میں صفحات محدود۔ ان روایات میں وہ تمام واقعات وقت ولادت، جو عام طور پر مولود کی کتابوں میں بیان کئے جاتے ہیں، موجود ہیں اور جنکی نسبت آپ نے سوالات کئے ہیں۔ نیز اور بھی بہت سے عجائب و خوارق بیان کئے گئے ہیں۔ (دیکھو صفحہ ۱۹)

چین بجبیں ہوں، مگر یہ واضح رہے کہ علامۂ موصوف کے رسوخ حدیث، وحفظ وضبط، واتقان فن کا وہ ارفع واعلیٰ مقام ہے، جس سے ان کے سخت سے سخت مخالف کو بھی کبھی انکار کی جرأت نہو سکی۔ حدیث ''کنت نبیًّا وادم بین الماء والطین'' کو (ان الفاظ کے ساتھ) علامۂ موصوف نے موضوع لکھا تھا۔ حافظ ابوالخیر (سخاوی) ایک فتوے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اس بارے میں ابن تیمیہ کے علم واسع اور حفظ حدیث پر اعتماد کر لینا، اعتماد کیلئے کافی ہے جسکا موافق اور مخالف دونوں کو اقرار ہے''

سخاوی کا یہ قول (زرقانی) نے مواہب کی شرح میں نقل کیا ہے۔ ؎۵

سب سے زیادہ یہ کہ حافظ (ذہبی) کا قول اس موقع پر یاد کر لینا چاہئے، جو کہتے ہیں کہ ما رایت اشد استحضارًا للمتون وعزوها منه، وكانت السنة بين عينيه ولسانه بعبارة رشيقة وعين مفتوحة!!

حافظ (ابونعیم) کے اس تساہل، موضوعات پر سکوت، اور نقل وجمع روایات میں بے احتیاطی کی شکایت صرف علامۂ موصوف ہی کو نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھکر ثبوت واضح اسکے لئے موجود ہے، یہی حافظ ذہبی، جنھوں نے تذکرہ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ (میزان) میں حافظ (ابونعیم) اور ان کے معاصر (ابن منده) کے باہمی طعن وقدح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

(بقیہ سابقہ نمبر ؎۴) اس رائے کو علامہ ابن تیمیہ نے کتاب التوسل میں لکھا ہے، لیکن کتاب اسوقت میرے پاس موجود نہیں ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے دیباچۂ سیرۃ نبوی نمبر (۲) مطبوعہ الهلال میں اس عبارت کو نقل کیا ہے اور صفحہ (۹۹) کا حوالہ دیا ہے۔ باقی کتابیں پیش نظر ہیں۔ منہ

؎۵ زرقانی کا یہ مقام میں نے دیکھا ہے اور یاد ہے لیکن اس وقت تلاش کرنا چاہا تو جلدی میں نہ نکال سکا۔ منہ

لا اقبل قول کل منھما فی الآخر، وھما عندی مقبولان لا اعلم ذنبا اکبر من روایتھما الموضوعات ساکتین علیھا!

"میں ان دونوں میں سے کسی کے طعن کو دوسرے کے حق میں قبول نہیں کرتا۔ میرے نزدیک دونوں مقبول ہیں۔ مجھے ان دونوں کا گناہ اس سے بڑھ کر تو اور کوئی نہیں معلوم کہ وہ جھوٹی حدیثیں روایت کرتے ہیں اور اس کی نسبت سکوت اختیار کر لیتے ہیں۔"

حافظ (ذہبی) کے نزدیک یہ غفلت ان کی مقبولیت میں خلل انداز نہیں، لیکن افسوس کہ اسی خطرناک مقبولیت نے اُن موضوعات و حکایات کو قوم میں پھیلا دیا، جنکی وجہ سے آج اسلام کو شرمندۂ اغیار، اور ہدفِ طعنۂ مخالفین و اجانب بننا پڑتا ہے۔

(۲) اب ان روایات پر نظر ڈالیئے، میں اس وقت اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ درایۃً ان کے مطالب کس درجہ قابل اعتراض و انکار ہیں؟ کیونکہ کہہ چکا ہوں کہ پہلی چیز نفسِ روایت کی صحت و عدم صحت ہے۔

ان روایات میں پہلی روایت (عمرو ابن قتیبہ) سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سُنا" وکان من اوعیۃ العلم"! انھوں نے اپنے والد کی فضیلت علمی تو بیان کر دی، لیکن کچھ نہیں معلوم کہ انھوں نے یہ واقعہ کیونکر معلوم کیا اور کس اعتماد پر بیان کر رہے ہیں؟ ذکر ولادت کی اکثر روایتیں منقطع ہیں (یعنی واقعہ تک راوی کا سلسلہ نہیں پہنچتا) لیکن یہ روایت منقطع روایات میں بھی بدترین منقطع ہے۔ دوسری روایت کے راوی اول حضرت (ابن عباسؓ) ہیں، لیکن ابن عباس واقعہ ولادت نبوی کے پچاس برس بعد پیدا ہوئے ہیں۔ نہیں معلوم انھوں نے کس سے سنا اور پھر باقی روایت کا پتہ نہیں۔ تیسری روایت میں خود تصریح کر دی ہے کہ "بسند ضعیف"، لیکن راوی کے اس انکسار طبع پر ہم قانع نہیں

ہو سکتے، کیونکہ یہ روایت ضعیف ہی نہیں بلکہ سرے سے موضوع ہے۔ روایت خود حضرت عباس سے ہے جو بطور جملۂ معترضہ کے آغاز حدیث میں کہتے ہیں:۔ ولد اخی عبد اللہ وھو اصغرنا (میرا بھائی عبد اللہ پیدا ہوا اور وہ ہم تمام بھائیوں میں سب سے زیادہ چھوٹا تھا) صرف یہی جملۂ معترضہ اس روایت کے موضوع ہونے کے لئے ایک محکم اندرونی شہادت ہے، کیونکہ بالاتفاق یہ مسلم ہے کہ حضرت عبداللہ، حضرت عباس سے بڑے تھے نہ کہ چھوٹے۔

حافظ ابن عبدالبر (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب) میں لکھتے ہیں:۔

(عباس بن عبد المطلب) عم رسول اللہ یکنیٰ ابالفضل بابنہ الفضل، وکان العباس اسن من رسول اللہ بسنتین وقیل بثلاث سنین (دیکھو کتاب مذکور جلد ۲ صفحہ ۷۹۴)

عباس بن عبد المطلب آنحضرت کے چچا، اپنے لڑکے فضل کی نسبت سے ابوالفضل کنیت رکھتے تھے۔ ان کی عمر آنحضرت سے صرف دو برس زائد تھی اور بعض نے کہا ہے کہ تین برس۔

جب خود حضرت عباس کی عمر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صرف دو تین برس زیادہ تھی، تو آپ کے والد سے کیونکر بڑے ہو سکتے ہیں؟

معلوم ہوتا ہے کہ جس نادان نے یہ قصہ گھڑ کر حضرت عباس کی طرف منسوب کیا ہے، یا تو اس غریب کو اسکی خبر نہ تھی، یا جانتا تھا اور روایت کو معتبر بنانے کے لئے قصداً یہ ٹکڑا داخل کر دیا تاکہ ضمناً ایک دوسرا مغالطہ دیکر روایت کو انقطاع سے محفوظ ثابت کر دے فکفیٰ بذلک کذبہ وبھتانہ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعمہ، ومن کذب علیہ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار۔

(۳) ایک سب سے بڑی دلیل واضح ان روایات واہیہ کے ناقابل اعتبار

ہونے کی یہ ہے کہ خود حافظ ابو نعیم نے (دلائل النبوۃ) میں ان روایات کو نقل نہیں کیا لہ حالانکہ اس میں ہر طرح کی ضعیف و منکر روائتیں بلا تامل جمع کردی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خود حافظ موصوف کے نزدیک یہ روایات اس درجہ واضح طور پر موضوع تھیں، کہ وہ ضعیف و منکر روایتوں میں بھی انھیں نہ لے سکے اور باوجود ان کے مذاق میں سب سے بڑے ذخیرۂ دلائل و اعلام نبوت ہونے کے، مجبوراً چھوڑ دینا پڑا۔

(۴) لیکن ان سب سے بڑھکر ایک برہان قاطع اور شہادت واضح (جو فی الحقیقت ان روایات کے موضوع ہونے کا آخری فیصلہ کر دیتی ہے) یہ ہے کہ خود حافظ سیوطی (خصائص کبریٰ) میں تیسری روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

هذا الاثر والاثران قبله، فيها نكارة شديدة، ولم اورد في كتابي هذا اشد نكارة منها ولم تكن نفسي تطيب بايرادها (فتامل) لكني تبعت الحافظ ابانعيم في ذلك! (خصائص کبریٰ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۴۹)

"یہ روایت اور اس کے قبل کی جو دو روائتیں ہیں توان سب میں نہایت سخت و شدید انکار و قباحت ہے اور باوجود انکے اشد شدید انکار کے میں نے اس کتاب میں جو درج کیا تو میرا دل اس امر کو پسند نہیں کرتا تھا مگر میں نے محض حافظ ابو نعیم کی پیروی کے خیال سے ایسا کر دیا۔"

حافظ سیوطی، ہر طرح کی رطب و یابس روایتوں کے جمع کرنے بلکہ ان سے استدلال کر دینے میں جس درجہ بے احتیاط اور تساہل پیشہ ہیں، وہ ارباب نظر سے مخفی نہیں۔

لہ دلائل النبوۃ دائرۃ المعارف حیدر آباد میں چھپ گئی ہے۔ اسکے پہلے حصے کے صفحہ (۳۲) میں (تزویج آمنہ) کا پورا باب دیکھ جائیے، بہت سی روایات ضعیفہ و واہیہ درج ہیں۔ مگر ان روایات کا پتہ نہیں۔ منہ

لیکن ان روایات کی لغویت کا یہ حال تھا کہ وہ بھی باایں ہمہ تساہل چپ نہ رہ سکے اور بے اختیار ہو کر انکار شدید کے ساتھ اسکی معذرت کرنی پڑی کہ محض حافظ (ابونعیم) کے اتباع کے خیال سے درج کردیتا ہوں!

وہ لکھتے ہیں کہ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ ان روایتوں کو درج کروں۔ غور کیجئے کہ جن روایتوں کے درج کرنے سے حافظ سیوطی کی طبیعت بھی اعراض کرے، وہ کس درجہ واہی و مزخرف ہوں گی؟

آج کل مناقب و فضائل اور واقعات و سیر میں مدعیان فن کی انتہائی سرحد حافظ سیوطی وا قرانہ ہیں، لیکن یہ کیسا دلچسپ اقرار خود حافظ موصوف کا ہے کہ میں ہر طرح واہی و منکر روایتیں لوگوں کے اتباع کے خیال سے درج کردیتا ہوں۔ فتاملوا وتفکروا ولا تغتروا باصحاب العمائم العجراء اذ قروھا واجازوھا، ان ھم الا اصحاب اوھام وشقاشق یتقربون بھا من العوام۔

کسر ایوانِ کسریٰ وغیرہ

آپ کے اکثر سوالات کا جواب ان روایات کی بحث میں آگیا، نیز بعض غیر مسئول عنہ امور کا بھی، لیکن ابھی ایک چوتھی روایت باقی ہے۔ جس میں آتشکدۂ ایران کے بجھ جانے، قصر نوشیرواں کے کنگوروں کے گرنے، کاہنوں کے پر اسرار و عجائب اظہارات اور ایک خطبۂ کہانت کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ روایت بھی پورے دو صفحہ کی ہے۔ سیوطی نے (خصائص) میں اور حافظ (ابونعیم) نے (دلائل) میں اسکو درج کیا ہے۔ اگر نقل کردوں تو پورے دو کالم مطلوب ہوں۔ خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ "آنحضرت کی ولادت کی رات کسریٰ کے ایوان میں زلزلہ محسوس ہوا، اسکے ۱۴۔ کنگورے گر گئے،

ایران کی وہ آگ جو ہزار سال سے نہیں بجھی تھی، بجھ گئی۔ بحیرہ ساوہ خشک ہوگیا نوشیرواں نے وزرا اور موبدوں کو جمع کر کے اسکی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے بھی خواب دیکھا ہے، عرب میں کوئی انقلاب ہونے والا ہے۔ اسپر نوشیرواں نے نعمان بن منذر کے نام خط لکھا کہ عرب سے ایک ایسا شخص بھیجدو جو میرے ہر سوال کا جواب دے، نعمان نے (عبدالمسیح) نامی ایک کاہن کو بھیجا۔ لیکن اس نے اپنے سے زیادہ عالم (سطیح) کاہن شام کو بتلایا، اور نوشیرواں کے سوالات لیکر وہ اسکے پاس گیا (سطیح) مرض الموت میں گرفتار تھا (عبدالمسیح) نے کہانت آمیز اشعار پڑھے، اور جب اس نے سر اٹھایا تو کہا " ھوی الی سطیح، وقد اوفی علی الضریح، بعثک ملک بنی ساسان، لارتجاس الایوان، وخمود النیران، ورویا الموبذان، رای ابلا صعابا، تقود خیلا عرابا، وغیرہ وغیرہ" لیکن سطیح مرگیا اور جواب کی مہلت نہ پائی۔[1]

لیکن یہ روایت بھی قطعًا ناقابل اعتنا ہے۔ اسکا راوی اول (مخزوم ابن ہانی) ہے جو اپنے باپ سے روایت کرتا ہے۔ خود حافظ سیوطی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

قال ابن عساکر:- حدیث غریب لا نعرفہ الا من حدیث ابن مخزوم عن ابیہ، تفرد بہ ابوایوب البجلی (جلد اول - صفحہ ۵۱)

ابن عساکر نے اس کی نسبت کہا ہے کہ حدیث غریب ہے جسکو سوائے ابن مخزوم کے اور کسی نے روایت نہیں کیا ہے۔

اس روایت کے واقعات بہ تغیر الفاظ وحذف واضافۂ بعض امور، فضائل و حکایات کی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں، لیکن اُن سب کی بنیاد یہی روایت ہے، والعبرۃ بما یروی المحدثون، لا بما یھذی بہ القصاصون الکاذبون۔

---

[1] پوری روایت کے لئے دلائل النبوۃ جلد اول صفحہ ۱۴۳ اور خصائص جلد اول صفحہ ۴۹ کو دیکھئے۔ منہ

قرآن نے کیا راہنمائی کی ہے؟

اسوۂ ابراہیمی

این رہ منزل قدس است میندیش و بیا
میل ازیں راہ خطا باشد ہیں تا نکنی!

بابل کے آثار قدیمہ نے جو ابھی حال میں برآمد ہوئے ہیں علمائے اثریات (Archaelogist) کی توجہ کو موجودہ صدی سے ہٹا کر آج سے تیس صدی بیشتر کی جانب پھیر دیا ہے، جبکہ عرفہ کی ایک کمزور مخلوق نے سیاروں کے طلوع و غروب سے خداشناسی کا سبق لیا تھا، اور ایک سیارہ پرست قوم کو ظلمات کفر سے روشنی میں لانے کی کوشش کی تھی۔

دنیا نے اپنے ابتدائی عہد میں ایک زمانہ وہ بھی دیکھا ہے، جب انسانی تمدن کی بدیع المثل ترقی نے قدرت اور بندوں میں کوئی حد فاصل باقی نہیں رکھی تھی۔ قدرت کے صدہا راز آشکارا ہو چلے تھے، اور جس قدر حیرت انگیز قدرتی طاقتیں مخفی تھیں، انسان نے تقریباً سب سے کام لینا سیکھ لیا تھا۔

آگ، پانی، ہوا، مٹی، کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس پر انسان نے حکومت نہ کی ہو۔ سیارۂ زمین کی عنان اختیار گویا ہاتھ میں تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ فضائے محیط کے کروں اور سیاروں کو بھی ایک طرح سے اپنا بنا لیا تھا، اور اپنی ضروریات میں ان کی مہیب طاقتوں سے بھی نہایت آسانی و سہولت کے ساتھ فائدہ

اُٹھا سکتے تھے۔

نقولا تسلا (نکولس ٹارلے) کو ہنوز مریخ کی آبادی سے تعلقات پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی ہے، لیکن تاریخ کو اس ابتدائی زمانے کے علمی و عملی ترقی پر حیرت ہے کہ زمین والے آسمان تک پہنچ گئے تھے، اور آسمانی آبادی سے جو چاہتے تھے کام لیتے تھے! بستاں بساتے، شہر کے برج بناتے، تو اُسکا قبہ آسمان تک پہنچا دیتے۔ سیرگاہیں اس شان کی ہوتیں کہ مکانات ہیں، عمارتیں ہیں، محلسرائیں ہیں، آبادی ہے، اور اوپر نظر اُٹھاؤ تو ایک وسیع اور بہت ہی وسیع باغ آویزاں ہے، شہر میں آیند و روند کی چہل پہل ہے، سڑکیں ہیں، گاڑیاں ہیں، دُکانیں ہیں، اور اوپر دیکھئے تو ایک عظیم الشان دریا لہریں مار رہا ہے!!

یہ عجیب و غریب مدنیت کلدانیوں کی تھی، جو ارض عراق کے فرمانروا تھے، جن کی جلالت کا یہ عالم تھا کہ توراۃ کے پیغمبر بھی اُنھیں عشر (محصول دہ یک) دیتے تھے، اور اُن کے قانون سے تالیف توراۃ میں مدد لیتے تھے۔

وسائل تمدن کی فراہمی و فراوانی ایک عالم کو سرکش بنا چکی ہے۔ ان الانسان لیطغیٰ ان راٰہ استغنیٰ۔

ایک ذرا سی ملکی و مالی عظمت، جو انسان کو انسانیت سے گزار دیتی ہے، جو اس قدر مغرور بنا دیتی ہے کہ لنڈن ٹائمس کے صفحات پر زبان سیاست کو اس اعلان سے بھی باک نہیں ہوتا کہ "ایک معمولی انگریز سپاہی کے خون کے مقابلہ میں تمام ایرانی آبادی کی کچھ وقعت نہیں"! جو ایک بااختیار ملکہ کی حیثیت میں ایک غاصب و ظالم و خونریز سلطنت کو انسانی قتل عام پر مبارکباد دیتی ہے۔ جو ایک فرماں روا سے یہ عصبیت ظاہر کراتی ہے کہ ایک

ملک کو چند قومیں پامال کر چکی ہیں، اور اب اُسے مجبور کرتی ہیں کہ اس پامالی پر قانع ہو جائے، جس نے ۲۵ برس پہلے ایک وزیر اعظم کی زبان سے ایک ایسے ملک کا خون چوس لینے کی تلقین کرائی تھی، جو خود اُسی کا محکوم تھا، جسپر اُس کی ثروت کی بنیادیں قائم تھیں، جو اُسکے تاج سلطنت کا درخشندہ گوہر مانا جاتا تھا، اور جسکے باشندوں نے اپنا ملک و مال خود اُسکے تصرف میں دے کر، اسے مطلق العنان کر دیا تھا کہ۔

محابا کیا ہے؟ میں ضامن، ادھر دیکھ شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟

غرضکہ وہی عظمت جب اپنے انتہائی مظاہر میں نمایاں ہوں تو انسان میں کہاں تک سرکشی نہ آئیگی؟ مادہ کی الوہیت کلدانیوں پر چھا گئی تھی، خدا کو بھول گئے تھے اور بندگانِ خدا کے ساتھ اُسی ظلم اور زبردست آزاری کے ساتھ پیش آئے تھے، جو آج موجودہ تمدن کے مخصوصات نمایاں میں سے ہے۔

کلکتہ، بمبئی، برلن، اور لندن میں جس طرح عظمائے رجال کے جابجا بُت نصب ہیں، اسی طرح کلدانیوں نے بے شمار مجسمے قائم کر رکھے تھے، اور اُن کی بے انتہا عزت کرتے تھے، چونکہ قدرت کو روئے زمین سے تاریکی مٹانی تھی، اسلئے اسی قوم اور اسی ملک سے ایک ایسے نامور اور عظیم الشان خدا شناس کو اُٹھایا، جس نے اس طلسم کی حقیقت واضح کر دی، اور کواکب پرست کلدانیوں پر ملکوت السموات والارض کے اسرار فاش کر دیے!

یہ خدا شناس ہستی ابراہیم علیہ السلام ابن آزر (تارخ) کی تھی، جن کو توحید و صداقت کی دعوت و اشاعت میں سخت سے سخت زحمتیں برداشت کرنی پڑیں، ملک کا ملک دشمن تھا، قوم کی قوم تشنۂ خون تھی، حکومت اپنی پوری طاقت سے مقاومت کو آمادہ تھی، ملک زمانہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس خدا پرست

مخلوق کو آگ کے حوالے کر کے رہینگے، با ایں ہمہ اُن کے عزم و استقلال کا یہ عالم تھا کہ بقول مسیحی مؤرخ (مارگری گوری ابوالفرج ملطی) کے "انھوں نے تن تنہا کلدانیوں کے بُت خانے میں آگ لگا دی (مختصر الدول۔ صفحہ ۲۱) اور اتنی بڑی مہم انجام دینے پر بھی کوئی زبردست طاقت اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ وہ بقول تورات "عراق سے ترکِ وطن کر کے صحیح و سلامت اُس ملک میں چلے گئے، جہاں خدا نے اُن کو برکت دینے اور اُنھیں ایک بڑی قوم بنانے کا وعدہ کیا تھا" (تکوین۔ ۱۲ × ۱-۵)

یہودیوں کی مقدس کتاب (تلمود) میں یہ واقعات شرح و لبسط سے مذکور ہیں، جن کو قرآن کریم نے اور زیادہ پھیلا کر بیان کیا ہے۔ سورۂ انبیا میں ہے:۔

ولقد اتینا ابراھیم رشدہ من قبل، و کنا بہ عالمین۔ اذ قال لابیہ و قومہ ماھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون؟ قالوا وجدنا اٰباءنا لھا عابدین، قال لقد کنتم انتم و اٰباؤکم فی ضلل مبین قالوا اجئتنا بالحق ام انت من اللاعبین؟ قال بل ربکم رب السموات والارض الذی فطرھن وانا علیٰ ذٰلکم من الشاھدین وتاللہ لاکیدن اصنامکم بعد ان تولوا مدبرین، فجعلھم جذاذاً الا کبیرا لھم لعلھم الیہ یرجعون، قالوا من فعل ھذا بالھتنا انہ لمن الظالمین، قالوا سمعنا

حضرت ابراہیم کو ہم نے ابتداء عمر ہی سے فہم سلیم اور درجۂ رشد و حکمت عطا فرمایا تھا، اور ہم اس سے اچھی طرح واقف تھے۔

دعوتِ الٰہی کے اُس مقدس وقت کو یاد کرو، جب انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ پتھر کی مورتیں جنکی پرستش پر تم جمے بیٹھے ہو، کیا ہیں؟ انھوں نے کہا "اسکے سوا ہم کچھ نہیں جانتے کہ اپنے بڑوں کو انکی پرستش کرتے دیکھتے آئے ہیں" حضرت ابراہیم نے کہا "پس یقیناً تم اور تمھارے بڑے دونوں صریح گمراہی میں پڑے رہے" اسپر انھوں نے کہا "یہ جو تم کہہ رہے ہو، کیا واقعی یہ تمھارا کوئی حقیقی خیال ہے؟ یا محض دل لگی کر رہے ہو؟" انھوں نے جواب دیا کہ "دل لگی

فتی یذکرھم یقال لہ ابراھیم، قالوا فاتوا بہ علی اعین الناس لعلھم یشھدون قالوا ءانت فعلت ھذا بالھتنا یا ابراھیم قال بل فعلہ کبیرھم ھذا فاسئلوھم ان کانوا ینطقون، فرجعوا الی انفسھم فقالوا انکم انتم الظالمون - ثم نکسوا علی رؤسھم، لقد علمت ما ھؤلاء ینطقون - قال افتعبدون من دون اللہ مالا ینفعکم شیئا ولا یضرکم اف لکم ولما تعبدون من دون اللہ، افلا تعقلون؟ قالوا حرقوہ وانصروا الھتکم ان کنتم فاعلین، قلنا یا نار کونی بردًا وسلامًا علی ابراھیم[۱] وارادوا بہ کیدًا

کی اسمیں کیا بات ہے؟ یہ تو اصلی حقیقت ہے کہ وہ، جسنے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، وہی تمھارا بھی پروردگار ہے، اور میں اپنی بصیرت اور یقین سے اسپر شہادت دیتا ہوں"

ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہدیا کہ میں بخدا ضرور بالضرور تمھارے ان بتوں سے تمھارے جانے کے بعد ایک چال چلونگا۔

چنانچہ حضرت ابراہیم لوگوں کے جانے کے بعد بُت خانے میں گئے، اور بتوں کو توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیا، صرف سب سے بڑے بت کو چھوڑ دیا کہ شاید وہ اسکی طرف رجوع کریں۔

جب لوگ آئے اور یہ حال دیکھا تو لگے آپسمیں کہنے کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ کس نے یہ گستاخی کی؟

[۱] حضرت ابراہیم کے حق میں آگ کیوں کر برد و سلام (ٹھنڈک اور سلامتی) بن گئی تھی؟ مفسرین نے اس باب میں بہت سی توجیہیں کی ہیں۔ ابو مسلم محمد بن بحر اصبہانی کا قول ہے "قلنا یا نار کونی بردًا وسلامًا، المعنی انہ سبحانہ جعل النار بردًا وسلامًا، لا ان ھناک کلامًا، کقولہ ان یقول لہ کن فیکون - ای یکونہ (تفسیر کبیر جلد ۴ - صفحہ ۱۷۵) یعنی قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ "ہم نے کہا اے آگ ابراہیم کے حق میں ٹھنڈک اور سلامتی بن جا" اسکے یہ معنی ہیں کہ خدا نے آتش فروزاد رفتنہ گر کالدانیوں کی آگ سے حضرت ابراہیم کا کچھ نقصان ہونے دیا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا نے یہ الفاظ بھی کہے تھے۔ اسکی نظیر کن فیکون والی آیت ہے، جسکے معنی یہ بتائے جاتے ہیں کہ خدا نے پیدا ہونے والے عالم کو مخاطب کر کے حکم دیا کہ ہو جا۔ وہ ہو گیا، یہاں بھی کچھ لفظوں میں یہ حکم نہیں ملا تھا اور نہ خدا نے واقعی گفتگو کی تھی، بلکہ صرف مطلب یہ کہ ارادۂ الٰہی ظہور عالم سے متعلق ہوا، اور اسی مشیت کے مطابق موزوں و مناسب طریق پر اُس کی تکوین ہونے لگی۔

فجعلناھم الاخسرین۔ جس شخص نے ایسا کیا یقیناً وہ بڑا ظالم تھا۔
ونجّیناہ و لوطًا الی الارض اسپر بعضوں نے کہا کہ وہ نوجوان جسے ابراہیم کے نام سے
التی بارکنا فیھا للعالمین پکارتے ہیں، ان بتوں کا ذکر کر رہا تھا۔ ہو نہو یہ اُنہی کی کارروائی
(۲۱ - ۷۰ - ۳ - ۷۲) ہے۔ لوگوں نے شور مچایا کہ اس کو یہاں سب کے سامنے پکڑ کے حاضر
کرو تاکہ جو کچھ سوال و جواب ہو اسکے لوگ گواہ رہیں۔

چنانچہ لوگ حضرت ابراہیم کو لیکر آئے، اور ان سے پوچھا کہ "اے ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت تو نے کی؟"

انھوں نے الزاماً کہا:۔

"نہیں، بلکہ یہ بُت جو سب میں بڑا ہے، اسی نے کی ہوگی۔ انھیں سے پوچھ لو اگر وہ جواب دے سکتے ہیں"!!

اس دنداں شکن جواب کو سُنکر سب کے سب ششدر رہ گئے، اور اپنے دل میں اپنی گمراہی کے قائل ہو کر آپس میں کہنے لگے کہ سچ ہے، تم ہی بر سر ناحق ہو!

مگر با ایں ہمہ سرکشی اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے، وہ پھر اپنے سروں کے بل اوندھے گمراہی کے گڑھوں دھکیل دیے گئے۔ اور حضرت ابراہیم سے کہنے لگے کہ یہ تم نے کیا کہا؟ تم کو تو معلوم ہے کہ بت بولا نہیں کرتے۔

انھوں نے کہا:۔ پھر یہ کیا بدبختی ہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو پوجتے ہو، جو خود ہی مجبور محض ہیں؟ نہ کسی کو کچھ نفع پہنچائیں اور نہ نقصان؟ تف ہے تم پر اور تمھاری اُن چیزوں پر، جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو! یہ کیا ہے کہ ایسی ظاہر اور کھلی بات بھی تمھاری سمجھ میں نہیں آتی؟؟

جب وہ لوگ حضرت ابراہیم سے عاجز آ گئے تو اور تو کچھ نہ کر سکے غیظ و غضب سے پاگل ہو کر آپس میں شور مچانے لگے کہ بس اگر کچھ کر سکتے ہو تو اسکا یہی جواب ہے کہ اس بے باک شخص کو آگ میں ڈالکر جلا دو اور اس طرح اپنے معبودوں کی حمایت کرو!

جبکہ وہ یہ تدبیریں کر رہے تھے، تو ہم بھی اپنی تدبیروں سے غافل نہ تھے۔ ہم نے اپنی قدرت کا اعجاز دکھلایا، اور کہا کہ اے آگ ٹھنڈی ہو جا، اور ابراہیم کے لیئے سلامتی۔

انسانوں نے ہمارے داعی الی الحق کو نقصان پہنچانا چاہا تھا، پر ہم نے انکو ناکام و خاسر کیا!!

بظاہر تو یہ ایک قصہ ہے، اور بدقسمتی سے ابتک اسی حیثیت سے اسپر نظر ڈالی گئی ہے، مگر غور کیجئے تو قرآن کریم نے اپنے انداز خاص میں ایک دفتر معارف کھولدیا ہے، جسکے ایک ایک لفظ کے اندر صدہا رموز اخلاق و سیاست اور حقائق و نوامیس اصلاح و دعوت پوشیدہ ہیں۔ مہلت ملے تو اس واقعہ کے ایک ایک ٹکڑے پر ایک ایک مقالہ مستقل طور پر لکھنا چاہیئے۔ سر دست صرف چند مناسب وقت اشارات آپ کے سامنے ہیں۔

فکر و تدبر سے کام لیجئے تو اس واقعہ سے چند خاص نتائج حاصل ہوتے ہیں:-

(۱) جس ملک میں ظلم عام ہو گیا ہو، خدا اور بندوں کے حقوق سر مشق تعدی و تطاول ہو رہے ہوں، شرک جیسے ظلم عظیم کے ارتکاب میں باک نہو، اللہ کو چھوڑکر دوسری طاقتوں اور انسانی قوتوں کے آگے لوگ سر بسجود ہوں، وہاں ہر اُس شخص کا، جس میں ایک ذرہ بھی ایمان و اسلام ہو، یہ ایک مقدس فرض ہے کہ مظالم و مفاسد کے استیصال کے لیئے آمادہ ہو جائے، اور بغیر کسی مداہنت و نفاق کے، کامل آزادی اور نڈر اور بے باک لب و لہجے میں خدا کے بندوں کو خدا کی جانب بلائے، اسلام کی علانیہ دعوت کرے، اور کفر و ضلالت کے مٹانے میں ذرا بھی متامل نہو۔

(۲) خدا کو استبداد لپسند نہیں، جو لوگ ارباب اقتدار ہوں، دولت و حکومت رکھتے ہوں، انسانوں پر اُن کا تصرف ہو، دنیا کی ہر ایک چیز پر اُنھیں فرمانروائی کی طاقت دی گئی ہو، پھر اتنی سب نعمتیں ملنے پر بھی خدا کو بھول جائیں، مستبدین

بیٹھیں، قانون الٰہی کو توڑنے لگیں، نظام اسلام کی توہین کریں، استبداد میں اتنا غلو رکھتے ہوں کہ انسان ہوکر خدا بن بیٹھیں، اور اپنے آئین استعباد کے خلاف کسی کی کچھ بھی سماعت نہ کرتے ہوں، تو ایسی قوم کو اُس کی غلط کاریوں سے علانیہ آگاہ کردینا چاہئے۔ علم حق و معروف لے کر مفاسد و منکرات کے خلاف آمادۂ جہاد ہونا چاہئے اور نہایت آزادی و استقلال کے ساتھ اس طرح اس خطرناک و سنگلاخ وادی میں قدم رکھنا چاہئے کہ یہ طلسم فریب ٹوٹ جائے، اور دنیا میں پھر خدا کی بادشاہی قائم ہوجائے۔

(۳) مسلم کی حدیث مشہور ہے:- من رأی منکم منکرًا فلیغیرہ بیدہ، فان لم یستطع فبلسانہ، فان لم یستطع فبقلبہ، وذٰلک اضعف الایمان۔

اس حدیث کو تم نے بارہا سُنا ہوگا، مگر کبھی اسکی تعلیم کے اصول و حقیقت پر نظر نہ ڈالی ہوگی۔ حضرت ابراہیم کے اسوۂ حسنہ سے اسکے سمجھنے میں مدد لو۔ یہ حدیث بتلاتی ہے کہ قانون الٰہی کے منشا اور احکام کے خلاف جہاں کوئی ایک بُرائی بھی نظر آئے، معًا ہر شخص پر لازم ہے کہ اپنے زور بازو سے اُسکے مٹانے کی کوشش کرے۔ یہ خصوصیت حقیقی ایمان داروں کی ہوگی۔ لیکن جس میں اتنی قوت نہو، وہ زبان سے بُرا کہے، اور بُرائی کے خلاف یہ آوازِ بلند احتجاج (پروٹسٹ) کرتا رہے۔ اس مذاق کے لوگ ایک طرح ناقص الایمان سمجھے جائینگے جس سے یہ بھی نہو سکے، وہ کم از کم اپنے دل ہی میں اس آگ کو سلگاتا رہے۔ یہ ایمان کا بالکل ہی آخری اور بہت ہی ضعیف و کمزور درجہ ہے۔ لیکن جو طبیعتیں اتنا احساس بھی نہ رکھتی ہوں اُن میں فرائض کی خواہ کتنی ہی پابندی موجود ہو، مگر یقین کرلینا چاہئے کہ ایمان سے اُن کو مطلق سروکار نہیں۔

مگر یاد رہے کہ ازالۂ منکرات و مفاسد کے لیے دل میں کُڑھنے اور زبان سے

نالہ و فریاد کرنے کی صورتیں اُسی وقت تک کے لئے ہیں، جب تک کہ ان سے کشود کار ممکن ہو۔ جہاں یہ باتیں بے سود ہوں، وہاں ایمان کا صرف ایک ہی مظہر ہے۔ اور وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو استعمالِ طاقت کے قابل بنائیں، اور پھر اُس طاقت سے منکرات اور مفاسد و مظالم کو مٹائیں۔

براءة من الله و رسوله الی الذین	جن مشرکین کے ساتھ تم نے عہد کر رکھا تھا، اللہ
عاهدتم من المشرکین۔	اور اُس کے رسول کی طرف سے انھیں صاف جواب ہے۔
وان تولیتم فاعلموا انکم غیر	اگر اب بھی تم پھرے رہے تو جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز
معجزی الله، وبشر الذین کفروا بعذاب الیم	نہ کر سکو گے، اور کافروں کو عذاب دردناک کی بشارت سنا دو۔
لا یستأذنک الذین یؤمنون بالله	جو لوگ خدا کا اور روزِ آخرت کا یقین رکھتے ہیں وہ تو
والیوم الاخر ان یجاهدوا باموالهم	تم سے اس بات کی رخصت مانگتے نہیں کہ اپنی جان و
وانفسهم، والله علیم بالمتقین۔	مال سے شریک جہاد نہوں، تم سے خواہانِ اجازت
انما یستأذنک الذین لا یؤمنون	تو وہی لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کا اور روزِ آخرت کا
بالله والیوم الاخر وارتابت	یقین نہیں رکھتے، اور انکے دل میں شک پڑے ہیں،
قلوبهم فهم فی ریبهم یترددون۔ (۹ : ۴۴)	پس وہ اپنے شک کی حالت میں حیران و سرگرداں پھر رہے ہیں

حضرت ابراہیم کے واقعات صاف بتا رہے ہیں کہ ایسی حالت میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے؟ دنیا میں اُس وقت وہی ایک مسلمان تھے، مگر نہ یہ تنہائی انھیں دعوت الی الحق سے مانع ہو سکی اور نہ اُنھوں نے ردِ مظالم اور تغییر منکر کے لئے صرف وظیفۂ قلب و زبان تک ہی کفایت کی، بلکہ جب یہ کوشش سود مند ہوتے نہ دیکھی تو دست و بازو سے بھی طاقت آزمائی کے لئے آمادہ ہو بیٹھے۔ پس ایمانداروں کو ضرور ہے کہ اس کی پیروی کریں۔

(۴) دعوت الی الحق کی ابتدا اپنے گھر سے چاہیئے، یہی صورت حضرت ابراہیم

نے اختیار کی، اور اسی کی تعلیم اظہارِ دعوت کا حکم دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تھی کہ وانذر عشیرتک الاقربین (اپنے قریب ترین اعزہ کو ڈراؤ) ان مبادی میں کامیابی ہو یا ناکامی، تاہم تجربہ و اختبار اور بصیرت کو اس سے مدد ملیگی، اور پھر دعوتِ عام کیلئے اسکیم مرتب کرنے میں صرف دماغ کی قوتِ متخیلہ ہی پر زور دینا نہ پڑے گا، بلکہ تجربہ وعمل کے نتائج سامنے ہوں گے۔

(۵) دعوت الی الحق کو مداہنت، پاس مراتب، لحاظ عظمت سے کچھ مہر وکار نہیں۔ کسی بزرگ کی بزرگی یا کسی عزیز کی محبت کا اس پر کوئی اثر نہ پڑنا چاہیے۔ اولاد پر والدین سے زیادہ کس کے احسانات ہونگے؟ لیکن دیکھتے نہیں کہ حضرت ابراہیم کو جو کچھ کہنا تھا، سب پہلے اپنے باپ ہی سے کہا، اور جو کچھ کرنا تھا اُسکے سرانجام دینے میں، باپ کے حقوق ابوت ذرا بھی مانع نہو سکے۔

(۶) احیاءِ صداقت اور اقامتِ حق اور عدل کیلئے مخفی تدابیر بھی کرنی پڑتی تھیں۔ پوشیدہ طور پر کید و تدبیر سے بھی کام لینے کی حاجت پڑتی ہے، اور اس مدعا کے لئے یہ تمام باتیں جائز و درست بلکہ ضروری و لازم العمل ہیں۔ حضرت ابراہیم نے بُت خانے میں کیا کیا تھا؟

(۷) کفر و شرک و استعباد نے دلوں میں خواہ کیسی ہی تاریکی پھیلادی ہو، انسان اپنی انسانیت سے کتنا ہی گزر گیا ہو، امتیاز حق و باطل کی طاقتیں مُردہ ہی کیوں نہو جائیں، تاہم حقیقت ایک ایسی چیز ہے کہ اخلاص کے ساتھ موثر انداز میں جب اُس کو پیش کیا جائیگا، تو سخت سے سخت منکروں کے سر بھی اُسکے آگے جُھک جائینگے۔ مستبدین کے غرور و جبروت سے مرعوب ہو کر دعوۃ الی الحق کی تحریک رُک نہیں جاتی، اور اگر رُکتی بھی ہے تو اس طرح کہ:-

رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

(۸) دعوت الی الحق کیلئے شجاعت قلب درکار ہے، جرأت لسان کی حاجت ہے، زورآور دست و بازو کی ضرورت ہے کہ خواہ کچھ ہی پیش آئے اور خواہ کیسی ہی زحمتیں سنگِ راہ ہوں مگر اپنے مشن کو سنبھالے رہے، کام کئے جائے اور کبھی مرعوب نہو۔

(۹) بڑے کام کیلئے بڑی قربانی کی ضرورت ہے، صرف دفع وقت سے دفع استبداد ممکن نہیں۔ اس قربانگاہ پر سب سے پہلے اپنی جان کی بھینٹ چڑھانے کیلئے آمادہ ہو جانا چاہیئے، اس راہ میں سنگلاخ منزلیں طے کرنی پڑیں گی، مشکل سے مشکل امتحان دینے ہونگے، شدائد و نوازل سے طرف مقابل ہونا پڑے گا، اور ہر قدم پر اس دستورالعمل کی پابندی کرنی پڑیگی کہ:۔

ترکِ جان و ترکِ مال و ترکِ سر در طریقِ عشق اوّل منزل ست

حضرت ابراہیم نے کیسی خطرناک جرأت کی تھی ؟

(۱۰) حق و صدق کی مقاومت ہمیشہ ناکام رہی ہے۔ دستِ ستم اسمیں خلل ڈال سکتا ہے، ضرر پہنچا سکتا ہے، پر اس کو فنا نہیں کر سکتا۔ عزم و ثبات سے تمام بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں، مخالفین ذلیل ہوتے ہیں استبداد سے نجات ملتی ہے، اور انجام کار برکت حاصل ہوتی ہے کہ والعاقبۃ للمتقین۔

دعوت الی الحق کی یہ نتیجہ خیز اسکیم خود حضرتِ الٰہی کی ترتیب دی ہوئی ہے۔ اب صرف اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ نئی اسکیم بنانیکی ضرورت نہیں۔ جو لوگ شب و روز نئی اسکیموں کا خواب دیکھتے ہیں، اُن کو یہ پیام پہنچا دو

یہ پاک موضوع اس سے زیادہ تشریح کا طالب تھا، مگر افسوس:۔

کہ بادہ حوصلہ سوز است و جملہ بدمستند

اُسوۂ نُوحؑ

ہشدار کہ سیلاب فنا در پیش است

ہاں مشو مغرور بر حلمِ خدا، قدرت کی آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی ہیں، جور و ستم، تشدّد و تباہ کاری، استبداد و مردم آزاری، ان سب پر خدا کی نظر ہے، جس طرح مسجدیں گرائی جاتی ہیں، خانقاہیں بند کرائی جاتی ہیں، کمزور جماعتیں ستائی جاتی ہیں، خدا ان تمام باتوں کو دیکھتا ہے سُنتا ہے، اور خاموش رہتا ہے کہ لعلھم یرشدون (شاید یہ خود ہی راہ راست پر آجائیں) زبردست ہستیوں کو جب اس پر بھی تنبہ نہیں ہوتا، زبردست آزاری میں طلق کمی نہیں آتی، طغیان و سرکشی حد سے بڑھ جاتی ہے، تو ان بطش ربک لشدید (پروردگار عالم کی گرفت بڑی سخت ہے) کی وعید ہیجان میں آتی ہے "دیر گیر و سخت گیر د مردرا" کا طوفان جوش کھاتا ہے اور تر و خشک سب کو بہالے جاتا ہے۔

اس ذیل میں سب سے پہلا طوفان وہ تھا جس نے عصر حجری و عصر نباتی کے بعد عصر حیوانی کے آغاز عہد میں تقریباً تمام دنیا کی حالت بدل دی تھی۔ علمی زبان میں اس طوفان کو "طوفان عام جیولوجی" کہتے ہیں، سطح زمین کی غلاظت نے اندر کی مشتعل حرارت کے تمام منافذ و مخارج بند کر رکھے تھے، بخارات کا التہاب بڑھتا رہا اور زمین کی ابتدائی حالت آتش افشانی کی گنجایش بھی نکال نہ سکی، استبداد کی تنگ گیریاں بہت دیر تک قائم نہیں رہ سکیں، سمندر کے وسط میں دفعتاً پہاڑیوں کا سلسلہ کھل گیا، ملتہب مادے جوش و خروش سے

پھوٹ بہے، ہولناک سیلاب نے تمام کرۂ زمین کو چھالیا، اور تقریباً جتنی جاندار ہستیاں تھیں سب کو بہالیگیا، یہ طوفان جسکی عمومیت ناقابل انکار ہے، موجودہ نسل انسانی سے قبل کا ہے، اس کے بعد جتنے طوفان آئے وہ خاص خاص ممالک و مقامات تک محدود تھے۔

نوع انسانی کی تکوین کے بعد جو طوفان آئے ہیں اُن میں سے سب سے بڑا اور سب سے پہلا طوفان غالباً ہندوستان کا تھا جسکی نسبت "ویشنو" نے اپنے ایک معتقد پوجاری کو اطلاع دی تھی کہ "سات دن میں ایک طوفان آئے گا جو اُن تمام مخلوقات کو کہ میری توہین کرتے ہیں ہلاک کرڈالیگا، تم ایک کشتی میں سات رشیوں اور اپنی عورتوں کے ساتھ بیٹھ جانا، اور ہر طرح کے حیوانات کو بھی بٹھالینا" اساطیر ہند (آرین میتھولوجی) کے مطابق یہ پیشینگوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ ویشنو نے خاتمۂ طوفان کے بعد شیطان کو قتل کرڈالا۔ وید مقدس کے جتنے نسخے تھے سب چھپا ڈالے، اور اپنے مخلص پوجاری کو الٰہیات کی تعلیم دے کر ساتویں "منو" کا خطاب عنایت کیا۔

دوسرا ہولناک طوفان جس کے واقعات قدیم کلدانی روایتوں میں ملتے ہیں، بابل میں آیا تھا، یہ واقعہ پادشاہ "ذی زوتروس" کے عہد کا ہے جسکو "خرولش" دیوتا (زحل) نے اس کی اطلاع دی تھی، اور خواب میں کہدیا تھا کہ انسان کے فتنہ و فساد نے مجھے غضبناک کر رکھا ہے، میں ان کو نابود کرونگا اور سب کو طوفان سے ہلاک کرڈالونگا، تم اور تمھارے خاندان والے البتہ بچ رہینگے۔ مبدء و منتہا و وسائط اشیاء کے متعلق جو تحریریں ہیں ان سب کو لیکر "سیبارلیس" (مدینۃ الشمس) میں دفن کردو، اور ایک کشتی بناؤ جو طول میں پانچ استاد اور عرض میں دو استاد کی ہو (ایک استاد ایک سو پچیس فیٹ کے برابر تھا

اہل وعیال کو لیکر کشتی میں سوار ہوجاؤ، اور اپنے آپ کو پانی کے سپرد کردو۔ ذی زوٹروس نے امتثال امر میں بڑی سرگرمی دکھائی، طوفان کم ہوا تو کشتی سے ایک دو چڑیے (گنجشک) اُڑا دیے، خشکی کا نام ونشان نہ تھا۔ پہلی مرتبہ چڑا واپس آیا، دوسری مرتبہ کی آمد میں پنجوں میں کیچڑ بھری تھی اور چونچ میں کوئی سبز گھاس تھی۔ معلوم ہوا کہ خشکی نمودار ہوچلی ہے۔ تیسری مرتبہ گیا تو پھر واپس نہ آیا، خشکی کا اب ٹھیک اندازہ ہوگیا تھا۔ کشتی آگے بڑھائی گئی۔ سامنے ایک پہاڑ نظر آیا۔ وہیں ٹھہرگئی۔ اہل کشتی اُتر پڑے، دیوتاؤں کے آگے سر کے بل گرے قربانگاہ بنائی، بھینٹ چڑھائی، مدینۃ الشمس سے دفینہ نکالا، بابل کو پھر آباد کیا اور بستیاں بسائیں۔

علمائے طبیعت وآثار کی رائے میں تورات کے واقعۂ طوفان نوح کی تفصیل اسی روایت سے ماخوذ ہے۔

تیسرا واقعہ "طوفان ہیرابولیس" کا ہے جسکی تشریح "لوسیانوس" نے کی ہے واقعات سب ملتے جلتے ہیں، حسب معمول اس طوفان کی نسبت بھی یہی ادعا ہے کہ صرف "دیکالیون" اور اُسکے گھر والے زندہ رہے تھے، اور ساری آبادی غرق ہوگئی تھی۔ دیکالیون کی کشتی "ہیرابولیس" کو پہنچکر ٹھہری تھی، وہیں اُس نے ایک ہیکل بنایا، جسکو پسینہ آتا تھا، اس پر وحی اُترتی تھی، اور وہ آدمیوں کیطرح باتیں کرتا تھا۔

چوتھا طوفان جزیرۂ ساموتراس کا تھا جس سے مؤرخ ڈیوڈورس کی رائے میں بحیرۂ مرمر (ملدموزرا) نکلا۔

پانچویں غرقابی قدیم یونان کے علاقہ "بولیسی" کے طوفان سے ہوئی جو بادشاہ (اوجیج) کے عہد میں حضرت مسیح سے نوسو برس بیشتر بحیرۂ "کوبالیس" میں

سیلاب آنے سے آیا تھا "آگسٹینس" نے جو مندر "ہیلیون" کا بڑا پوجاری تھا اسکے جزئیات پر نہایت شرح و بسط سے گفتگو کی ہے اور "وینس" (زہرہ) دیوتا کے دفعۃً رنگ وصورت وحجم ورفتار بدل جانے کا اسے نتیجہ ٹھہرایا ہے، ادبیات مشرق میں یونان کی غرقابی یہیں سے نکلی ہے۔

چھٹا طوفان پادشاہ "دیکالیون" فرماں روائے تھسلی کے عہد میں میلاد مسیح سے ایک ہزار چھ سو برس قبل آیا تھا، اور تھسلی کو بہالے گیا تھا۔ ہیرو ڈوٹس کی روایت ہے کہ تھسلی ایک بڑا دریا تھا، سمندر کے دیوتا "نبتون" نے اُسکا پانی بہا دیا اور ملک میں طوفان آگیا۔

ان واقعات پر خرافات کا اثر تو ضرور غالب ہے، مگر اصلیت سے خالی نہیں علم الطبیعۃ کے مشہور ترین فرانسیسی مؤلف (موسیو ڈوبے) نے تاریخ الانسان الطبیعی (ص ۲۴-۲۸-۳۵ و ۴۲) میں انپر نہایت حکیمانہ نظر سے ریویو کیا ہے

ساتواں طوفان حضرت نوح کے عہد میں آیا تھا، یہ حادثہ میلاد مسیح سے تین ہزار ۳۴۰ برس قبل کا ہے، اور اس وقت پانچ ہزار دو سو ۵۰ برس اس کو ہو چکے ہیں۔ قرآن کریم نے اسکی پوری تشریح کی ہے، سورۂ ہود میں ہے:

ولقد ارسلنا نوحا الی قومہ انی	ہم نے نوح کو اُن کی قوم کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا
لکم نذیر مبین، ان لا تعبدوا	کہ "لوگو میں تم کو صاف صاف خطرہ سے آگاہ کئے
الا اللہ، انی اخاف علیکم	دیتا ہوں کہ خدا کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کیا کرو۔
عذاب یوم الیم، فقال الملأ	مجھکو تمھاری نسبت ایک روز دردناک کے عذاب کا
الذین کفروا من قومہ مانرٰک	خوف ہے" سرداران قوم کفار نے اس پیغام کو سُن کر
الا بشرا مثلنا وما نرٰک اتبعک	کہا کہ "ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ہی جیسے بشر تم بھی
الا الذین ھم اراذلنا بادی الرای	ہو، بظاہر ہم میں جو ادنیٰ درجہ کے لوگ ہیں اُنھیں نے

وما نریٰ لکم علینا من فضل
بل نظنکم کاذبین، قال یاقوم
ارءیتم ان کنت علی بینۃ من
ربی واٰتانی رحمۃ من عندہ
فعمیت علیکم، انلزمکموھا
وانتم لھا کارھون؟ ویاقوم
لا اسألکم علیہ مالا، ان اجری
الا علی اللہ، وما انا بطارد الذین
امنوا، انھم ملاقوا ربھم، و
لکنی اراکم قوما تجھلون، ویاقوم
من ینصرنی من اللہ ان طردتھم؟
افلا تذکرون؟ ولا اقول لکم
عندی خزائن اللہ، ولا اعلم
الغیب، ولا اقول انی ملک و
لا اقول للذین تزدری اعینکم
لن یؤتیھم اللہ خیرا، اللہ اعلم
بما فی انفسھم، انی اذا لمن
الظالمین، قالوا یا نوح قد جادلتنا
فاکثرت جدالنا فأتنا بما تعدنا
ان کنت من الصادقین؟ قال
انما یاتیکم بہ اللہ ان شاء وما

تمھاری پیروی بھی کی ہے، اپنی نسبت تم لوگوں میں ہمکو تو کوئی برتری بھی نظر نہیں آتی، بلکہ ہم تو تمکو جھوٹا سمجھتے ہیں" نوح نے جواب دیا کہ "تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟ میں اگر اپنے پروردگار کے کھلے رستے پر ہوں، اُس نے مجکو اپنے جناب سے نعمت و رحمت بھی عطا کی ہو، تم کو وہ رستہ دکھائی بھی نہیں دیتا، تو اس حالت میں کہ تم اُسکو مکروہ جانتے ہو کیا ہم اُسپر تمھیں مجبور کر سکتے ہیں؟ لوگو! میں ان کو اگر نکال بھی دوں تو خدا کے مقابلے میں کون میری مدد کریگا؟ کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟ میں یہ نہیں کہتا کہ (۱) میرے پاس خدا کے خزانے ہیں (۲) نہ میں غیب جانتا ہوں (۳) نہ اپنے آپ کو فرشتہ کہتا ہوں (۴) اور جو لوگ تمھاری نظروں میں حقیر ہیں میں اُن کی نسبت یہ بھی نہیں کہتا کہ خدا ان پر فضل ہی نہ کریگا، ان کے دل کی بات تو خدا ہی جانتا ہے۔ میں ایسا کہوں تو ایک ظالم میں بھی ہونگا"

کفار نے کہا: "نوح! تم ہم سے بہت جھگڑ چکے، سچے ہو تو جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو اُسے لاؤ؟"

نوح نے جواب دیا کہ "خدا کو منظور ہوگا تو وہی عذاب بھی تم پر نازل کریگا، تم خدا کو عاجز نہ کر سکوگے، اور خدا ہی کو اگر تمھیں گمراہ کرنا منظور ہے تو میں کتنی ہی نصیحت کرنی چاہوں میری نصیحت تمھارے کام نہ آئیگی

انتم بمعجزین، ولا ینفعکم نصحی ان اردت ان انصح لکم ان کان اللہ یرید ان یغویکم، ھو ربکم والیہ ترجعون۔

وہی تمھارا پروردگار ہے۔ اور اُسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے۔

ام یقولون افتراہ، قل ان افتریتہ فعلیّ اجرامی وانا بریٔ مما تجرمون۔

کیا وہ کہتے ہیں کہ "یہ باتیں بنا رکھی ہیں"؟ تم کہدو کہ "میں نے اگر یہ باتیں بنائی ہیں تو اس کا گناہ مجھ پر ہے اور تم جو گناہ کرتے ہو میں اُس سے بری الذمہ ہوں۔

واوحی الی نوح انہ لن یؤمن من قومک الا من قد امن فلا تبتئس بما کانوا یفعلون، و اصنع الفلک باعیننا ووحینا ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انھم مغرقون،

نوحؑ کو وحی ہوئی کہ "تمھاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اُن کے علاوہ اب ہرگز کوئی ایمان لائیگا، یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں تم اُسکا کچھ غم نہ کرو، تم ایک کشتی ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق بناؤ، اور ان ظالموں کے متعلق مخاطب نہ کرو، یہ ضرور غرق ہوں گے۔

ویصنع الفلک، وکلما مرّ علیہ ملاء من قومہ سخروا منہ، قال ان تسخروا منا، فانا نسخر منکم کما تسخرون، فسوف تعلمون من یاتیہ عذاب یخزیہ ویحل علیہ عذاب مقیم،

نوحؑ کشتی بنانے لگے، قوم کے وجیہ اور سردار لوگوں کا جب اُن پر گذر ہوتا تو وہ اُن سے تمسخر کرتے، نوحؑ جواب دیتے کہ "تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو جیسے آج تم ہم پر ہنس رہے ہو اسی طرح کل کو ہم بھی تم پر ہنسینگے، عنقریب تم کو معلوم ہو جائیگا کہ رسوائی بخش عذاب کس پر آتا ہے۔ اور دائمی تکلیف کس کی راہ میں حائل ہوتی ہے؟

حتی اذا جاء امرنا وفار التنور قلنا احمل فیھا من کل زوجین

یہ کیفیت اسی طرح رہی، یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آیا اور تنور نے جوش کھایا تو ہم نے نوحؑ کو کہا کہ ہر ایک

اثنین واھلک الا من سبق	کشتی میں بٹھالو۔ ہر جوڑے کے دو دو جفت کو۔
علیہ القول ومن اٰمن، وما	اپنے گھر والوں کو۔ اُن کے علاوہ جنکی نسبت پہلے قول
اٰمن معہ الا قلیل ،	ہو چکا ہے۔ اور اُن کو جو ایمان لا چکے ہیں" اور اُن کے

ساتھ تھوڑے سے ہی لوگ ایمان لائے تھے۔

وقال ارکبوا فیھا بسم اللہ مجرھا	نوح نے ان سب سے کہا "آؤ کشتی میں بیٹھ جاؤ،
ومرسٰھا ، ان ربی لغفور رحیم ،	بسم اللہ مجریھا ومرساھا ، حقیقت میں میرا
وھی تجری بھم فی موج کالجبال ،	پروردگار غفور رحیم ہے" کشتی ان سب کو پہاڑ
ونادیٰ نوح ابنہ وکان فی معزل	جیسی موجوں میں لئے چلی جارہی تھی ، اس حالت
یا بنی ارکب معنا، ولا تکن مع	میں نوح نے اپنے بیٹے کو ، جو الگ تھا۔ پکارا کہ
الکافرین ، قال ساٰوی الیٰ جبل	"بیٹا ! آؤ ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ ، کافروں کے
یعصمنی من الماء ، قال لا	ساتھ نہ رہو" اُس نے کہا " میں ابھی کسی پہاڑ کے
عاصم الیوم من امر اللہ الا من	سہارے جالگتا ہوں ، وہ مجھے پانی سے بچا لے گا"
رحم ، وحال بینھما الموج فکان	نوح نے کہا "آج کے دن خدا کے غضب سے کوئی بچانیوالا
من المغرقین ،	نہیں ، بچے تو وہی بچے جس پر خدا رحم کرے" اسی حالت

میں باپ بیٹے کے مابین ایک موج حائل ہوگئی ، ڈوبنے والوں کے ساتھ نوح کا بیٹا بھی ڈبو دیا گیا۔

وقیل یا ارض ابلعی ماءک ، و	کام تمام ہو چکا تو حکم دیا گیا کہ " اے زمین اپنا پانی
یا سماء اقلعی ، وغیض الماء ،	جذب کرلے ، اور اے آسمان تھم جا۔" پانی اتر گیا۔
وقضی الامر ، واستوت علی	کام کی تکمیل ہوئی ۔ کشتی کوہ جودی پر جا ٹھہری ، اور
الجودی ، وقیل بعدا للقوم	کہدیا گیا کہ " ظالموں کی جماعت دور ہو"
الظالمین ،	
ونادیٰ نوح ربہ فقال رب ان	نوح نے اپنے پروردگار کو پکارا اور عرض کیا

ابنی من اھلی وان وعدك الحق وانت احکم الحاکمین۔ قال یا نوح انہ لیس من اھلك انہ عمل غیر صالح، فلا تسئلن ما لیس لك بہ علم، انی اعظك ان تکون من الجاھلین، قال رب انی اعوذ بك ان اسئلك ما لیس لی بہ علم، والا تغفر لی وترحمنی اکن من الخاسرین۔ قیل یا نوح اھبط بسلام منا وبرکات علیك وعلیٰ امم ممن معك، وامم سنمتعھم ثم یمسھم منا عذاب الیم۔ (۱۱-۱۹-۲۰)

"اے میرے پروردگار، میرا بیٹا بھی میرے ہی گھر والوں میں ہے، تیرا وعدہ سچا ہے، اور تو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے" جواب ملا کہ "اے نوح وہ تمھارے گھر والوں میں شامل نہیں، وہ بدکار ہے، جو بات نہ جانتے ہو ہم سے اُس کی درخواست نہ کرو، ہم تمھیں سمجھائے دیتے ہیں کہ نادانوں کی سی باتیں نہ کرو" نوح نے عرض کیا کہ "اے میرے پروردگار، میں ایسی جرأت سے تیری ہی پناہ مانگتا ہوں کہ جس چیز کی حقیقت معلوم نہ ہو تجھ سے اُس کی درخواست کروں، میری گستاخی اگر تو نہ بخشیگا اور مجھ پر رحم نہ کرے گا تو میں تباہ ہو جاؤنگا" سب کچھ جب ہو چکا تو حکم دیا گیا کہ "اے نوح ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ کشتی پر سے نیچے اُترو۔ یہ برکتیں تمھارے اور اُن اقوام کے شامل حال رہینگی، جو تمھارے ساتھ ہیں۔ بعد کی قومیں بھی ہم سے نفع اُٹھائیں گی، لیکن آخرکار ہماری جانب سے اُن کو دردناک عذاب پہونچیگا"

یہ واقعات کسی قدر اضافہ و اختصار کے ساتھ تورات میں بھی مذکور ہیں، تورات نے ان میں کچھ باتیں بڑھا دیں، کچھ حذف کر دیں۔ کچھ خبط کر ڈالیں۔ مثلاً۔

(۱) تورات کا بیان ہے کہ طوفان عام تھا، روئے زمین کے جتنے براعظم اور جزیرے تھے، سب غرق ہو گئے تھے "پانی زمین پر بے انتہا چڑھ گیا، تمام اونچے پہاڑ جو آسمان کے نیچے ہیں سب چھپ گئے، سارے جاندار جو زمین پر

چلتے تھے۔ پرند، چرند، جنگلی جانور، اور کیڑے مکوڑے جو زمین پر رینگتے تھے اور جتنے انسان تھے سب مرگئے۔ ہر ایک متنفس مخلوق جو خشکی پر تھی، مرگئی۔ روئے زمین کے تمام موجودات جن میں جان تھی سب کے سب مٹ گئے۔ انسان سے لیکر حیوان تک، کیڑے مکوڑوں اور آسمانی پرندوں تک سب مٹ گئے۔ فقط نوح اور جو اُسکے ساتھ کشتی کے اندر تھے، بچ رہے (تکوین ۷۔ ۱۹۔ ۲۳)

یہ عمومیت عقل کے بھی خلاف تھی، تاریخ بھی خاص اس واقعہ کی تعمیم میں اس امر کی مؤید نہ تھی، علم الآثار بھی تکذیب کر رہا تھا، طبقات الارض کی شہادت بھی اسکے حق میں نہ تھی، اور یہ بات تو کسی طرح قیاس میں آسکتی ہی نہ تھی کہ صرف ایک گنہگار قوم کو سزا دینے کے لئے خدا نے سارے جہان کو جسمیں بہت سی بیگناہ جماعتیں بھی رہی ہونگی، بہت سے بے قصور اشخاص بھی ہونگے بہت سی ناکردہ گناہ آبادیاں بھی ہونگی، غرق کرڈالے، اور روئے زمین پر کسی متنفس کو زندہ ہی نہ چھوڑے۔

یہ ایرادیں آج اس زمانے میں وارد کی جارہی ہیں، لیکن قرآن کریم نے اُس عہد میں جبکہ طوفان نوح کی عمومیت سے کسی کو انکار نہ تھا، صاف لفظوں میں اعلان کردیا کہ الذین ظلموا انھم مغرقون (جن لوگوں نے ظلم کیا ہے وہی غرق کئے جائینگے) قوم نوح اس ظلم وستم کی خوگر تھی، وہی مغروق ہوئی، اُنھیں بستیوں میں طوفان آیا، اور سیلاب فنا اُنھیں ظالموں کو بہالے گیا۔

(۲) فرزند نوح کے تذکرے سے جو کافروں کا شریک حال تھا اور طوفان میں ڈوب کر مرگیا۔ تورات خاموش تھی، قرآن نے یہ فروگذاشت

ظاہر کردی، اور دکھادیا کہ مؤلفین تورات کی جمع وتالیف کس پایہ کی ہے۔

(۳) واقعۂ طوفان کے بعد حضرت نوح کی توجہ کاروبار زراعت کیجانب مصروف ہوئی۔ انگور کا ایک باغ لگایا، شراب نکالی، اور پی کر مست ہوگئے گھر میں پہونچے تو نشہ کا عالم تھا، کپڑے اُتار دیے اور سورہے۔ حام نے اُن کو برہنہ دیکھکر اپنے بھائیوں کو خبر دی۔ سام و یافث گئے اور برہنگی چھپا دی۔ بیدار ہونے پر جب حضرت نوح کو واقعہ معلوم ہوا تو کنعان کو بد دعا دی تورات نے اس بد دعا کے الفاظ بھی نقل کر دیے ہیں کہ "کنعان ملعون ہو، وہ اپنے بھائیوں کے غلاموں کا غلام ہوگا، خداوند سام کا خدا مبارک، کنعان اُس کا غلام ہوگا، خدا یافث کو پھیلائے، وہ سام کے ڈیروں میں رہے، اور کنعان اُس کا غلام ہو" (تکوین۔ ۹۔ ۲۵۔ ۲۷) حام حضرت نوح کا بیٹا تھا (تکوین۔ ۷۔ ۱۰ و ۱۸ و ۱۰۔ ۱) اور کنعان حام کا لڑکا تھا (تکوین ۱۰۔ ۶ و ۹۔ ۲۲) گستاخی کنعان سے نہیں بلکہ اُسکے باپ حام سے سرزد ہوئی تھی (تکوین ۹۔ ۲۳ و ۲۵) لیکن تورات صاف کہہ رہی ہے کہ حضرت نوح اُس سے ذرا بھی نہ بولے، نہ ناراض ہوئے۔ اظہار جلال ہوا بھی تو کنعان پر جو بالکل بے قصور تھا، اور جسے اس واقعہ سے براہِ راست کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ قرآن نے اس کہانی کا تذکرہ تک نہ کیا، اور خاموشی کی زبان میں بتا دیا کہ سرے سے یہ مذکور ہی غلط ہے۔ بل کذبوا بما لم یحیطوا بہ علما۔

قرآن موعظت وعبرت ہے، اخلاق وثواب ہے، بشیر ترقی ونذیر تنزل ہے۔ لیکن تاریخ وتمثیل نہیں ہے، بااینہمہ جو غلط واقعے مشہور ہو جاتے ہیں کبھی کبھی اُن کی تصحیح کر دیا کرتا ہے۔ حضرت نوح کا واقعہ بیان کرکے وہ بڑے دعوے سے اعلان کر رہا ہے:۔

تلك من انباء الغیب نوحیها الیك، ما کنت تعلمها انت ولا قومك من قبل هذا، فاصبر، ان العاقبة للمتقین، (۱۱-۴۱)	یہ غیب کی چند خبریں ہیں، ہم ان کو بطریق وحی تم کو سناتے ہیں، اس سے پیشتر تم اور تمھاری قوم کسی کو بھی اس کا علم نہ تھا، اب صبر و ثبات کو شیوہ بناؤ، جو لوگ متقی ہیں اُنھیں کا انجام بخیر ہے۔

طوفان کیونکر آیا؟ مفسرین کی غالب اور عام رائے یہ ہے کہ کھانا پکانے کا ایک تنور تھا، اُسی سے طوفان کا چشمہ پھوٹا، لیکن اس خیال میں کوئی انداز مجاز یا تمثیل مضمر تھی جو نہیں سمجھی گئی۔

تورات کا بیان ہے کہ "جب نوح کی عمر چھ سو برس کی ہوئی، دوسرے مہینے کی سترھویں تاریخ کو اُسی روز بحر محیط کے تمام سوتے پھوٹ نکلے آسمان کی کھڑکیاں کھُل گئیں، اور چالیس شبانہ روز تک زمین پر مینہ کی جھڑی لگی رہی" (تکوین ۷-۱۱)

قرآن کریم نے بھی اسی حقیقت کی تائید کی ہے، سورۂ قمر میں ہے :۔

ففتحنا ابواب السماء بماء منهمر وفجرنا الارض عیونا فالتقی الماء علی امر قد قدر (۵۴-۱۱ و ۱۲)	ہم نے موسلا دھار مینہ سے آسمان کے دروازے کھول دیے، زمین کے سوتے جاری کر دیے، آخر جو اندازہ مقرر ہوا تھا اُسی کے مطابق آسمان کے پانی مل گئے۔

بے شبہ فار التنور (تنور جوش میں آیا) کے الفاظ بھی قرآن کریم میں موجود ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قدیم محاورۂ عرب میں "تنور" "روئے زمین" کو کہتے تھے، حدیث میں ہے :۔

عن ابن عباس انه قال فی قوله "وفار التنور" قال التنور وجه الارض	"تنور نے جوش کھایا" کی تفسیر میں عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ "تنور کے معنی

قال قیل لہ اذا رایت الماء علی وجہ الارض فارکب انت ومن معک، قال والعرب تسمی وجہ الارض تنور الارض[1]

روئے زمین کے ہیں، یعنی حضرت نوح کو حکم ہوا کہ جب دیکھو کہ روئے زمین پر پانی چڑھ گیا تو اپنے ساتھیوں کو لے کر کشتی میں سوار ہو جاؤ، اہل عرب نے "روئے زمین" کا نام "تنور زمین" رکھ چھوڑا ہے۔

تورات کے موجودہ تراجم نے کشتی نوح کا مستقر کوہ اراراط کو قرار دیا ہے (تکوین ۸-۴) لیکن علامہ یاقوت حموی نے اصل زبان سے تورات کا جو لفظی ترجمہ پیش کیا ہے اُس میں بجائے اراراط "جودی" مذکور ہے[2] (معجم البلدان طبع مصر۔ جلد ۳۔ صفحہ ۱۶۳)، یہ پہاڑی (جودی) موصل کے علاقہ میں دریائے دجلہ کے مشرقی جانب واقع ہے، اور یہی وہ علاقہ ہے جس کے مضافات میں، قوم نوح آباد تھی، اصل میں "جودی" ایک گانوں کا نام تھا

[1] رواہ ابوجعفر قال حدثنی یعقوب بن ابراہیم قال حدثنا ھشیم قال اخبرنا العوام بن حوشب عن الضحاک عن ابن عباس انہ قال الخ، وبطریق اٰخر عن المثنیٰ قال ثنا عمرو بن عوف قال اخبرنا ھشیم عن العوام عن الضحاک بنحوہ۔ وبروایۃ اخریٰ عن ابی کریب وابی السائب قالا ثنا ابن ادریس قال اخبرنا الشیبانی عن عکرمۃ فی قولہ وفار التنور قال وجہ الارض، وبروایۃ اخریٰ قال حدثنا زکریا بن یحیی بن ابی زائدۃ وسفیان بن وکیع قالا ثنا ابن ادریس عن الشیبانی عن عکرمۃ وفار التنور قال وجہ الارض۔

[2] سریانی وکلدانی زبان میں توراۃ کے جو نسخے ہیں اُن میں بھی سفینۂ نوح کا مستقر کوہ جودی مذکور ہے۔ دائرۃ المعارف العربیہ کے مسیحی مؤلفین لکھتے ہیں کہ روایات اب تک اسی قول کی تائید میں ہیں کہ اس حادثہ کا مرکز یہی پہاڑی (جودی) تھی، بیروسس جو اسکندر اعظم کا معاصر تھا، اسکی بھی یہی رائے ہے۔ کوہ جودی کی چوٹی پر کشتی کے آثار بھی اُس کو ملے تھے (دائرۃ المعارف۔ حرف جیم)

(معجم البلدان - جلد ۳ - صفحہ ۱۵) اور پہاڑی کا وہ سلسلہ جو اُس گاؤں سے متصل تھا کوہ جودی کے نام سے مشہور تھا۔ اسی نواح میں "قردا" و "بازبدا" کی مشہور آبادیاں بھی تھیں۔ وہاں یہ پہاڑی انھیں بستیوں کے نام سے موسوم تھی۔ ابو حنیفہ دینوری نے اسی مناسبت سے کشتی نوح کا مستقر جبل قردا و بازبدا کو ٹھہرایا ہے (اخبار الطوال صفحہ ۳) اور ابن قتیبہ نے بھی یہی روایت نقل کی ہے (معارف صفحہ ۸) مشہور مسیحی مؤرخ گریگوری ابوالفرج ملطی نے ان سب کی تطبیق کر دی ہے کہ جبل قردا اور کوہ جودی دونوں ایک ہی ہیں (مختصر الدول صفحہ ۱۲) کوہ ارارط کا وسیع سلسلہ جابجا مختلف ناموں سے مشہور تھا، تورات کے موجودہ ترجمہ میں صرف پہاڑ کا اصلی نام بتا دینا کافی سمجھا گیا لیکن قرآن نے اُس پہاڑی چوٹی کی جگہ بھی بتا دی جہاں کشتی ٹھہری تھی۔

واقعۂ نوح کی ذیل میں تعلیم الٰہی کے خاص خاص پہلو یہ ہیں:-

(۱) مادہ کی گوناگوں صورتگری جب کسی قوم کو خدا سے بالکل ہی غافل بنا دے قانونِ الٰہی کی حدود ٹوٹنے لگیں، طغیان و سرکشی عام ہو جائے، علم کی فراوانی حجاب اکبر کا کام دینے لگے، تمدن ضلالت کی جانب رہنمائی کرتا ہو، خدائے واحد کی پرستش سے اتنا بھی سروکار نہ ہو کہ اُس کی پرستشگاہوں کا ادب کیا جائے، تو ان حالتوں میں دعوت الی الحق فرض ہے اور اس فرض کے ادا کرنے میں خواہ کیسی ہی بندشیں عائد ہوں، زبان تقریر کو روکنے کے لئے مجرمانہ سازشوں کے نام سے قانون بنائے جائیں، سلسلۂ تحریر کو بند رکھنے کی غرض سے تعزیری ایکٹ پاس ہوتا ہو، ایں ہمہ ان بندشوں سے جو نتائج پیش آنیوالے ہوں اُن کے اظہار سے خاموش نہ رہنا چاہئے، اور علانیہ کہدینا چاہئے کہ اس گمراہی کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

(۲) دعوۃ الی الحق کے لئے جو لوگ کمر بستہ ہونگے انھیں اس فرض ادا کرنے میں اپنی شاندار امتیازی حیثیت قائم کرنے کی فکر نہونی چاہیئے کہ ارباب اقتدار کی نظروں میں درخورحاصل کرکے پہلے اپنی ممتاز پوزیشن قائم کرلیں پھر کام شروع کریں۔ یہ بے راہ رو ی کا طریقہ ہے، اور ایسی خصوصیت کی تمنا خام خیالی ہے داعی الی الحق کو بظاہر اُس کی کمزور پوزیشن پر طعنے دیے جائینگے، تعریض ہوگی، بے وقعتی کی جائیگی، اُن کو جھوٹا کہا جائیگا، ہنسی اُڑائی جائے گی، وہ ان سب کو انگیز کر لینگے، اور اپنے فرض کو پورا کرکے رہینگے۔

(۳) داعی الی الحق کی جماعت کچھ ایسی وسیع نہو گی، معمولی افراد اُس کے شریک عمل ہونگے، جو عام نظروں میں ذلیل ورذیل دکھلائی دینگے۔ انھیں یہ بھی خصوصیت نہو گی کہ جن مقتدر جباروں کی دعوت کرنی ہو اُن پر کچھ احسان کئے ہوں یا انھیں منت پذیر بنانے کے لئے چندے دیے ہوں، رزولیوشن پاس کرائے ہوں، وہ اس طلسم فریب سے اپنے کام کو تقویت نہ دینگے، بلکہ نہایت صفائی اور سادگی کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہونگے، اور جو کرنا ہو گا کر گذرینگے۔

(۴) دعوت الی الحق کے لئے صاف بیانی، تلخ گوئی، اور درشت گفتاری ناگزیر ہے، البتہ صداقت کو تسلیم کرانے میں کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

(۵) دعوت الی الحق حصولِ جاہ و کسب مناصب کا ذریعہ نہیں ہے کہ اُس کے نام سے اچھے اچھے عہدے حاصل کئے جائیں، پبلک سروس میں نمایاں جگہیں ملیں، مال و دولت بڑھے۔ اس مقدس فرض کا معاوضہ دینے والا صرف خدا ہے، اجر یا اُجرت جو بیش نظر ہو اُسی سے طلب کرنی چاہیئے۔

(۶) جو لوگ داعی الی الحق کے شریک عمل ہوں اُن سے بے تعلقی و علیحدگی کے لئے خواہ کیسا ہی دباؤ ڈالا جائے مگر سختی سے انکار کر دینا چاہیئے۔

(۷) داعی الی الحق کے پاس نہ خدائی کے خزانے ہونگے، نہ اُس میں فرشتوں کی صفت ہوگی، نہ غیب داں ہوگا، انسان کی معمولی حیثیت رکھتا ہوگا، اور اسی حالت میں بڑے بڑے جبّاروں کی حیثیت بگاڑ دینے کا الٹیمیٹم دیگا۔

(۸) دعوۃ الی الحق کے لئے موقع و محل کی تلاش بے سود ہے کہ مستبدین کی طبیعت جب حاضر دیکھ لیں اُس وقت تبلیغ کا کام شروع کریں۔ یہ موقع شناسی ضروری نہیں۔ ہر حالت میں کام کرتے رہنا چاہیئے اور اس شدت سے کرنا چاہیئے کہ دیکھنے والے گھبرا اٹھیں، سُننے والے تنگ آجائیں، اور برملا کہنے لگیں کہ مقابلے کے لئے ہم طیار رہیں، جو کچھ کرنا ہو تم بھی کر دیکھو۔

(۹) نتیجہ ناکامیاب ہی کیوں نہ رہے، استبداد میں خواہ کچھ بھی فرق نہ آئے مگر دعوۃ الی الحق کی سرگرمی میں فرق نہ آنا چاہیئے۔ جو لوگ دھمکی دے رہے ہوں کہ ہم نے تلوار سے فتوحات حاصل کئے ہیں، تلوار ہی کے زور سے اس کو قائم بھی رکھینگے، اُن کو جواب دے دینا چاہیئے کہ خدا کو اختیار ہے، چاہے تم کو تباہ کر ڈالے یا زندہ رہنے دے، دعوۃ الی الحق کو ان امور سے تعلق نہیں ہے۔

(۱۰) دعوۃ الی الحق مشکوک و مشتبہ نظروں سے دیکھی جائیگی، اُسکے داعیوں کو سخن ساز و مفتری کہا جائیگا، لیکن سلسلۂ سعی و تدبیر میں ان باتوں میں سُستی نہ آنی چاہیئے۔ البتہ اپنی پوزیشن کو واضح کر دینا چاہیئے۔

(۱۱) طغیان و جبروت کا انہماک دلوں اور دماغوں میں قبول حق کی صلاحیت باقی ہی نہیں رہنے دیتا۔ ایسی طبیعتیں کبھی راہِ راست پر نہیں آسکتیں، اُن سے کنارہ کش ہوجانا چاہیئے، قطع نظر کر لینی چاہیئے، اور انھیں بالکل ہی بائیکاٹ کر دینا چاہیئے، وہ ظالم ہیں، ستم پیشہ ہیں، سیلاب فنا میں غرق ہوجائینگے، ان سے متعلق کسی قسم کی گفتگو نہ کرو، اپنے بچاؤ کی آپ تدبیر نکالو، طوفانِ حوادث



سے محفوظ رہنے کے لئے سفینۂ نجات بناؤ، اُس کے بنانے میں سرگرمی کے ساتھ لگے رہو، اور خدا نے جو تعلیم دی ہے اُسی کے مطابق کام کرو۔

(۱۲) اس کام میں انہماک و سرگرمی کو دیکھ کر لوگ ہنسینگے، ہنسنے دو، تمھیں اپنے کام سے کام ہے۔

(۱۳) حفاظت کا جو ذریعہ اختیار کیا جائے وہ صرف اپنے لئے مخصوص نہ ہونا چاہئے، بقدر گنجایش ارباب استبداد کے علاوہ جو عذاب الٰہی کے مستحق ہیں۔ ایک حد تک دوسرے بندگانِ خدا کے لئے بھی سامانِ حفاظت بہم پہونچانا چاہئے، مگر اس کی نوعیتیں مختلف نہ ہوں، اور جامعۂ وحدت میں خلل نہ پڑے۔

(۱۴) جبّاروں سے بے تعلقی و بائیکاٹ میں قرابت و رشتہ داری کا پاس لحاظ ممنوع ہے، کوئی خاص عزیز ہی کیوں نہ ہو، نہایت اہم خصوصیت کیوں نہ رکھتا ہو، مگر دائرۂ حق و صدق سے جہاں باہر قدم نکالے کہ تباہی آئی، ایسے لوگ وہی ہیں جو عملِ صالح اور حقیقی کیرکٹر سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ کفار کی طرح اُنکو بھی بائیکاٹ کر دینا چاہئے۔ اُن پر رحم کرنا یا اُن کے حق میں سفارش کرنی جرم ہے اور سخت جرم ہے۔ اس سے توبہ کرنی چاہئے۔

(۱۵) ظالموں اور جباروں کو ہدایت نہیں ہوا کرتی۔ ذرھم فی طغیانھم یعمھون، اُن کی سرکشانہ ضلالت کچھ زمانے تک قائم رہیگی۔ کچھ مدت تک بندوں پر خدائی کرتے رہیں گے، آخر خدا کی حجت پوری ہوگی۔ اپنی روش تبدیل کرنے کے لئے انھیں متعدد موقع دیے جائینگے، مگر اُن کے استبداد میں کیوں فرق آنے لگا، انجام کار سب کے سب نیست و نابود ہو جائینگے حکومت جاتی رہیگی، سطوت و عزت فنا ہو جائے گی، نام و نشان تک مٹ جائے گا،

دُنیا میں خدا کی پادشاہی قائم ہوگی، اور پھر اُنھیں مظلوموں کو برکاتِ الٰہی نصیب ہوں گے جن کی آزار رسانی میں ایک دنیا کو مزہ آرہا ہے۔

(۱۶) فنائے استبداد کے بعد مسلمان کامیاب ہوں گے، اُن پر خدا کی رحمت نازل ہوگی، زمانہ بھر کی نعمتوں سے مستفید ہوں گے، لیکن بعد کی نسلیں جب خدا کو بھول جائیں گی۔ جب اضطہاد و استعباد زنگ لائیگا، جب پھر عزم و ثبات و استقلال میں ضعف آنے لگیگا۔ تو اُن پر بھی تباہی آئے گی، کامیابی کے لئے صبر و ثبات و تقویٰ ایک لازمی چیز ہے، جو قوم اس کی خوگر نہ ہوگی، جس نے قدرت کو اپنے استقلال و اتقاد (علی کیرکٹر) کا ثبوت نہ دیا ہوگا اُسے کامیابی کی توقع ہی نہ رکھنی چاہیئے۔

ام حسبتم ان تدخلوا	کیا تم اس خیال میں ہو کہ بہشت میں
الجنۃ ولما یعلم	داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی تک
اللہ الذین جاھدوا منکم	اللہ نے نہ تو اُن لوگوں کو جانچا جو تم میں سے
ویعلم الصابرین؟ (۳-ع ۱۴)	جہاد کرنے والے ہیں اور نہ اُن کا امتحان

کیا جو ثابت قدم رہتے ہیں؟

یہ واقعات پیش آنے والے ہیں، اور ضرور پیش آنے والے ہیں، فارتقب حتی یاتی اللہ بامرہ۔

اس میں کامیابی مطلوب ہو تو سلسلۂ عمل کی توسیع، صبر و ثبات کا اعتصام، اور تقویٰ و طہارتِ نفس کا تعود پیدا کرو۔

لیستخلفنکم فی الارض کما استخلف الذین من قبلکم ولیبدلنکم من بعد خوفکم امناً۔

لَاتُلقُوا بِاَیدِیکُم اِلَی التَّہلُکَۃِ

غلطیہائے مضامین مست پوچھ، کہتے ہیں :- انسان کو اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالنا منع ہے، اصول کی صحت میں کلام نہیں، لیکن جو فروع نکالے جاتے ہیں خود اُن کی تفریع ہلاکت آفریں ہے۔ طبیعت میں استقلال ہے تو ہوا کرے، عزم و ثبات پر تیقن ہے تو ہونے دو، تم کوئی بڑا کام نہ کرو مہمات امور میں کبھی اقدام نہ کرو۔

ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے اگر انگلستان میں انگریزوں کو سول سروس کی تعلیم دلانے کی غرض سے ہر سال کچھ کم ۱۶ ہزار پونڈ (دو لاکھ چالیس ہزار روپے) خزانۂ ہند کو ادا کرنے پڑتے ہیں، اور پھر ان سویلنوں سے ہندوستانیوں کی قسمت وابستہ ہوتی ہے، تو اُن کو رعایا کی عبادتگاہیں ڈھانے خانقاہیں گرانے کے احکام نافذ کرانے میں بھی باک نہیں ہوتا، جب بھی کچھ نہ کہو۔

اگر پنجاب کی نہری آبادیوں میں رعایا کی ضروریات زندگی میں گورنمنٹ کی جانب سے کوئی مدد نہیں ملتی، اور مزارعین سے نہایت گراں شرح پر مال گذاری وصول کی جاتی ہے، تو اس شکایت کی تلافی کے لئے دیوان عام (ہاؤس آف کامنس) میں نائب وزیر ہند (مسٹر مانٹیگو) کا صرف یہ جواب کافی سمجھ لینا چاہئے کہ "ایک سیاح نے ایک ہفتہ وار رسالے میں یہ اقعات شائع کئے ہیں، مگر دوسرے اشخاص نے جو حالات لکھے ہیں اُن سے یہ بیانات

مختلف ہیں۔ اس لئے قابل تیقن نہیں کیے جا سکتے۔"

اگر ایک انگریز (جیمس ہنڈرسن) وکٹوریا جیوٹ مل کے ایک ہندوستانی مزدور پر حملہ کر کے اُسے ضرب شدید پہونچاتا ہے، وہ اسی صدمہ سے بیس دن کے اندر مر جاتا ہے، مقدمہ دائر ہوتا ہے، عدالت اس تعدی کو خطرناک قرار دیتی ہے، مگر مجرم پر صرف ایک سو روپیہ جرمانہ کافی سمجھتی ہے۔ پارلیمنٹ میں سوال ہوتا ہے، مسٹر اوگریڈی سفارش کرتے ہیں کہ "جیمس ہنڈرسن" کو ہندوستان سے ملک بدر کر دینا چاہیے، اور عدالتوں کو تنبیہ کرنی چاہیے کہ اس قسم کے مقدمات میں ہندوستانیوں اور یوروپین لوگوں کے مابین فرق نہ کیا کریں، تو گورنمنٹ کی اس تشریح پر قانع ہو جاؤ کہ "ہنڈرسن نے قلی کو شراب کے نشے میں مارا تھا، اور ہیضہ سے مرا تھا۔ وزیر ہند اس معاملہ میں کسی کارروائی کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔

اگر جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ کے مظالم ہندوستانی مزدوروں پر بدستور قائم ہیں، اگر حکومت ہند کی یہ قرارداد بھی نافذ العمل نہ ہو سکی کہ آئندہ سے جنوبی افریقہ کیلئے ہندوستان سے قلی نہ بھیجے جائیں، تو دیوان عام میں مسٹر ہارکورٹ کے اظہار تاسف سے اشک شوئی کر لو کہ گورنمنٹ کوئی چارہ کار نہیں نکالتی نہ سہی اُسکو افسوس تو ہے

اگر مدراس وسدرن مرہٹہ ریلوے کے ورکشاپ مدراس میں ریلوے کے ایک انگریز اہلکار نے تین ہندوستانیوں کو اس ہفتہ میں محض اسلئے گولی مار دی کہ اس کے خیال میں "وحشی ہندوستانی اُس کی مہذب میم کو گالیاں دے رہے تھے"، تو اس حادثے کو ادبیات اردو کے اس شاعرانہ تخیل کا ذریعۂ تکمیل سمجھو کہ:۔

کس نے یوں پیار کیا؟ کس نے وفا کی اپنی ۔ کیوں کریں قتل کسی کو وہ ہمارے ہوتے؟

اس قسم کے غیر معمولی حوادث طغیان و استبداد کو معمولی تحمّل سے انگیز کر لیا کرو، ان پر آزردگی بے جا و بے محل ہے۔

قارئین کرام نے ملاحظہ فرما لیا ہوگا کہ لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کی تفسیر میں آجکل عوام نے سمجھ رکھا ہے کہ غیر معمولی حوادث طغیان و استبداد کو معمولی تحمل سے انگیز کر لینا چاہیئے اور وفاداری کے نتائج میں ہمیشہ:۔

"بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش"

کا فلسفہ مضمر رہنا چاہیئے، اور خواہ کتنی ہی اذیتیں پہونچیں، مگر ہر حال میں صبر و شکر سے برداشت کرنا چاہیئے:۔

کہ انچہ ساقیِ ما ریخت عینِ الطاف است

ان پر نکتہ چینی کرنا شانِ عقیدت و اخلاص کے خلاف ہے، انگریز ہمارے حاکم ہیں، ہمارے حق میں جو چاہیں کریں لا یسئل عما یفعل وھم یسألون:۔

گر براند ور بخواند روے وسر بر آستانم
بندہ را فرماں نباشد انچہ فرماید بر آنم

اعضائے حکومت کی شکایت ہی کیا ہم گلے شکوے کر کے اپنے آپ کو تہلکے میں کیوں ڈالو؟ مقابلے کی طاقت نہیں، مقاومت کا زور نہیں، پھر شکایت کرنا صریح اپنے آپ کو ہلاکت میں پھنسانا ہے۔

یہ خیالات ہیں جو آجکل عموماً دلوں میں آتے اور زبانوں سے ادا ہوتے ہیں۔ انقلاب کی خواہش تو بے معنی ہے، جایز نکتہ چینی بھی ناجائز سمجھ لی گئی ہے، مذہب کی تائید سے بھی اس باب میں مدد لی جاتی ہے، اور ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ (اپنے تئیں اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں

نہ ڈالو) کی دلیل دی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے امام رازی نے اس نکتہ آفرینی کی جانب توجہ مبذول کی ہے، فرماتے ہیں:۔

المراد من قوله :- ولا تلقوا بایدیکم الی التهلكة ای لا تقتحموا فی الحرب بحیث لا ترجون النفع و لا یکون لکم فیه الا قتل انفسکم فان ذلك لا یحل، وانما یجب ان یقتحم اذا طمع فی النکایة وان خاف القتل فاما اذا کان آیسا من النکایة وکان الاغلب انه مقتول فلیس له ان یقدم علیه۔ (تفسیر کبیر ج ۱ - ص ۶۸۴)	"اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو" اس سے مراد یہ ہے کہ ایسی لڑائی میں جہاں فائدے کی امید نہ ہو، بلکہ جان جانے کا خوف ہو، کبھی نہ ہاتھ ڈالو، یہ بات شرعاً حلال و مباح نہیں ہے، اس میں دست اندازی اُس وقت لازم ہے جب دشمنوں کو تعزیر دینے کی طمع ہو، خواہ اس میں قتل ہو جانے ہی کا خوف کیوں نہ ہو، لیکن اگر تعزیر دینے سے ناامیدی ہو، اور غالب یقین یہی ہو کہ خود ہی قتل ہو جائنگے تو اس حالت میں ایسی پیش قدمی نہ کرنی چاہئے

اس مطلب پر امام رازی نے چند اعتراضات بھی کئے ہیں، لیکن آخر میں جواب بھی خود ہی بتا دیے ہیں کہ مطلب بھی مصدق ہو جائے، شبہات بھی نہ رہیں، اور بات کی دل آویزی میں بھی فرق نہ آنے پائے۔

امام رازی کا زمانہ وہ تھا جب اسلامی تمدن میں انحطاط شروع ہو چکا تھا، ہمتیں پست ہو رہی تھیں، فتوحات کا سلسلہ بند تھا، شواتی وصوالف کی جگہ خانہ جنگیوں نے لے لی تھی ۶۰۶ھ میں امام رازی کی وفات ہوئی۔ اور ۶۷۰ھ میں یعنی امام رازی کی وفات سے ۳۹ برس قبل تاتاریوں کا سیلاب دریائے جیحون کو عبور کر کے خوارزم کا رخ کر چکا تھا۔ مصر و شام و روم و تونس میں صلیبیوں کے حملے ہو رہے تھے، بلادِ اسلام میں قتل عام برپا تھا

کفار ایک ایک شہر کو فتح کرتے تھے، مفتوحین کو تہ تیغ کر کے سارے شہر کو آگ لگا دیتے تھے، مرعوبیت اس قدر چھا گئی تھی کہ حملہ آوروں کی مقاومت و مدافعت کا عزم یساقون الی الموت کے مرادف سمجھ لی گئی تھی۔

ایسی حالت میں اگر جان بچانے کا خوف غالب ہو، اگر ناکامی کا تیقن کامیابی کے لئے کوششیں کرنے سے روکتا ہو، اگر پیش قدمی کے معنی ہلاکت کے لئے جاتے ہوں، اگر جنگ دفاعی میں موت کی تصویر نظر آتی ہو، تو یہ ایک قدرتی امر ہے۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ فیلسوف طبیعتیں کیوں نہ قرآن کریم سے ایسے معنی نکالیں، اور ہلاکت کے تخیل سے ہمتوں میں تہلکہ ڈالیں؟ زمانے کی رفتار، گرد و پیش کے حالات، اور مجرائے سیاست کی تبدیلیوں کا ہر ایک چیز پر اثر پڑتا ہے۔ تنزل پذیر جماعتیں ترقی کی آیتوں کو اپنے شان انحطاط کے مناسب بنا لیتی ہیں۔ محکوم قوموں کو مغلوبیت کی ناپاک غلامی کے لئے بھی کتاب و سنت سے ثبوت ملجاتا ہے۔

لیکن یہ باتیں واقع میں اگر بجائے خود ثابت ہیں، اور انسان کو اپنے ظاہری ساز و سامان کی بنا پر، جبتک کامیابی کا قطعی یقین نہ ہو، اُس وقت تک مہمات امور میں ہاتھ ڈالنے کے معنی اگر ہلاکت مول لینے کے ہیں، تو صدر اوّل کی وہ پاک و برگزیدہ ہستیاں جو نہایت بے سر و سامانی کے عالم میں کسریٰ و قیصر کے تخت و تاج پر قبضہ کرنے چلی تھیں، ایک بہت مختصر جمعیت سے بدر و حنین کے مہم سر کرنے اٹھی تھیں۔ ردّت عرب کے موقع پر سارے ملک سے جنگ کرنے کو آمادہ تھیں، اور اس نازک حالت میں جبکہ ہر شخص کو اندیشہ تھا کہ مدینۂ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر مرتد قبائل کا حملہ ہوا چاہتا ہے، ارض موتہ میں رومن امپائر سے آویزش

کے لئے فوج روانہ کررہی تھیں، وہ اُس وقت یقیناً خدا کے صاف حکم (لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ) کی صریح مخالفت کررہی ہوں گی۔ و حاشاھم عن ذالک

بے شبہ اُن بزرگوں کے حوصلے اپنی بے ساز و برگ جماعت کی قلت اور دشمنوں کی کثرت سے پست نہ ہوتے ہوں گے، اُن کو خدا کے وعدے پر وثوق ہوگا کہ ایمان کی زبردست طاقت سے وہ ساری دنیا کو زیر کرسکتے ہیں ظاہری وسائل اقدام و دفاع سے وہ بھی محروم تھے، اور ہم بھی ہیں۔ قوت ایمانی اُن میں بھی تھی اور ہم بھی اسی کے مدعی ہیں۔ یہی خصوصیت انھیں ایک زمانے پر غالب رکھتی تھی، اور اسی کے طفیل میں، ہم بھی مغلوبیت سے بچ سکتے ہیں، لیکن اگر اس خصوصیت (ایمان) سے ہم بے بہرہ ہیں تو پھر مسلمان ہی نہیں۔ اور جب اسلام ہی نہ رہا تو ترقی کی توقع کیا اور تنزل کا گلہ کیوں؟

الذین اتخذوا دینھم لھوا و لعبًا وَغرتھم الحیاۃ الدنیا فالیوم ننساھم کما نسوا لقاء یومھم ھذا، وما کانوا بآیاتنا یجحدون، (۷ - ع ۶)

جن لوگوں نے اپنے دین کو لہو لعب بنا رکھا تھا اور دنیا کی زندگی اُن کو دھوکے میں ڈالے ہوئے تھی، تو جس طرح اپنے اس دن کے پیش آنے کو وہ بھول گئے تھے اُسی طرح ہم بھی آج اُن کو بھلا دینگے گو وہ ہماری آیتوں کے منکر نہ تھے۔

وہ آیت جس سے مسلمانوں کے ہلاکت میں نہ پڑنے کا استدلال کیا جاتا ہے سورۂ بقرہ میں ہے، اور وہ یہ ہے:-

وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ، واحسنوا، الخ

اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اپنے ہاتھوں اپنے تئیں ہلاکت میں نہ ڈالو اور احسان کیا کرو

اللہ یحب المحسنین (۲-ع ۲۴) بے شک احسان کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر تین طرح پر کی گئی ہے :-

(۱) اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اور جہاد کو کسی حالت میں ترک نہ ہونے دو، کیونکہ اس کا ترک کرنا اپنے آپ کو تہلکے میں ڈالنا ہے۔ اس باب میں ترمذی[۱] نے ایک صحیح حدیث روایت کی ہے جس کے خاص الفاظ یہ ہیں :-

عن اسلم بن ابی عمران قال	اسلم بن ابی عمران سے روایت ہے کہ ہم لوگ روم
کنا بمدینۃ الروم فاخرجوا الینا	کے شہر (قسطنطنیہ) میں کفار سے جہاد کر رہے تھے،
صفا عظیما من الروم فخرج	رومیوں نے ایک بڑی جماعت ہمارے مقابلے کو بھیجی
الیہم رجل من المسلمین حتی	مسلمانوں کے لشکر سے ایک شخص مقابلے کو نکلا اور
دخل فیہم فصاح الناس و	حملہ کرتا ہوا رومیوں کی صف میں چلا گیا۔ یہ دیکھ کر
قالوا :- سبحان اللہ یلقی بیدایہ	لوگ چلا اٹھے کہ "سبحان اللہ! اپنے ہاتھوں اپنے تئیں
الی التہلکۃ، فقام ابو ایوب الانصاری	تہلکے میں ڈالتا ہے" ابو ایوب انصاری نے اٹھ کر
فقال :- یا ایہا الناس انکم لتتاولون	کہا کہ "لوگو! تم اس آیت کی یہ تاویل کرتے ہو حالانکہ
ہذہ الآیۃ ہذا التاویل وانما	یہ آیت ہم انصاریوں کے باب میں اس وقت اتری تھی
نزلت ہذہ الآیۃ فینا معشر	جب اسلام کو خدا غالب کر چکا تھا، اور بہت سے
الانصار لما اعز اللہ الاسلام	لوگ اسکے مددگار ہو چکے تھے۔ ہم میں سے بعض شخص
وکثر ناصروہ فقال بعضنا لبعض	نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپا کر آپس میں
سرا دون رسول اللہ صلی اللہ	پوشیدہ طور سے یہ صلاح کی کہ "اسلام کی اعانت
علیہ وسلم ان اموالنا قد ضاعت	میں خرچ کرتے کرتے ہمارا مال وزر تلف ہو گیا

[۱] ابواب تفسیر القرآن من الجامع الصحیح لابی عیسی محمد بن عیسی بن سورۃ الترمذی المتوفی سنہ ۲۷۹ للہجرۃ۔

اب خدا نے اسلام کو غالب کیا ہے، اور اُس کے	وان اللہ قد اعز الاسلام وکثر
بہت سے مددگار پیدا ہو چکے ہیں، اب اگر ہم اپنے	ناصروہ فلو اقمنا فی اموالنا
مال و زر کا انتظام کریں، اور جو تلف ہو چکا ہے	فاصلحنا ما ضاع منھا، فانزل اللہ
اُس کی تلافی کے لئے کوئی اصلاحی طریقہ نکالیں تو	تبارک وتعالیٰ علی نبیہ صلی اللہ
بہتر ہے۔" اللہ تعالیٰ نے ہم کو جواب دینے کے لئے	علیہ وسلم یرد علینا ما قلنا
اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ آیت نازل کی	"وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا
کہ "اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو"	بایدیکم الی التھلکۃ" فکانت التھلکۃ
ہلاکت کا مطلب مال و دولت کا انتظام و اصلاح و ترک	الاقامۃ علی الاموال واصلاحھا
جہاد تھا۔" اس روایت کے بعد ابو ایوب برابر جہاد کرتے	وترکنا الغزو، فمازال ابو ایوب شاخصًا فی
رہے، حتیٰ کہ سرزمین روم ہی میں دفن بھی ہوئے ؎۱	سبیل اللہ حتی دفن بارض الروم ؎۱

(۲) تہلکے کے معنی ناامیدی کے ہیں اس باب میں ۲ احدیثیں مروی ہیں جن میں ایک خاص روایت یہ ہے:-

"اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو" کی تفسیر میں	عن البراء بن عازب فی قولہ ولا تلقوا
براء بن عازب سے روایت ہے کہ اپنے آپ کو	بایدیکم الی التھلکۃ قال ھو الرجل
ہلاکت میں ڈالنے والا وہ شخص ہے جس نے گناہ	یصیب الذنوب فیلقی بیدہ الی
کئے ہوں اور سمجھ لیا ہو، کہ میں ہلاک ہو گیا	التھلکۃ یقول لا توبۃ لی ؎۲

؎۱ الترمذی قال حدثنا عبد بن حمید الضحاک بن مخلد ابو عاصم النبیل عن حیاۃ بن شریح عن یزید بن حبیب عن اسلم بن عمران قال الخ ثم اتبعہ بقولہ وھذا حدیث حسن غریب صحیح۔

؎۲ ابن جریر قال حدثنی محمد بن عبد المحاربی قال ثنا ابو الاحوص عن ابی اسحاق عن البراء بن عازب فی قولہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ قال الخ۔

نہ میرے لئے مغفرت ہے نہ میری توبہ قبول ہوگی۔

(۳) آیت میں تہلکہ سے مراد یہ ہے کہ خرچ نہو تو جہاد کا اقدام کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، اس باب میں ابوزید کا صرف ایک قول منقول ہے، مگر باقی تمام روایتیں اس کے مخالف ہیں، اور سخت مخالف ہیں۔

(۴) انفاق فی سبیل اللہ سے باز رہنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اس کی تائید میں ۲۵ حدیثیں مروی ہیں، جن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک یہ روایت نہایت قابل اعتماد ہے :۔

لیس التھلکۃ ان یقتل الرجل فی سبیل اللہ، ولکن الامساک فی سبیل اللہ ؎

ہلاکتؔ یہ نہیں ہے کہ انسان اللہ کی راہ میں قتل ہوجائے، ہلاکت یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے باز رہے۔

ابن جریر نے اس آخری توجیہ کو مرجح مانا ہے وہ لکھتے ہیں :۔

الصواب من القول فی ذلک عندی ان یقال ان اللہ جل ثناءہ امر بالانفاق فی سبیلہ .... ومعنی ذلک وانفقوا فی اعزاز دینی الذی شرعتہ لکم بجہاد عدوکم الناصبین لکم علی الکفر بی، ونھاھم ان یلقوا بایدیھم الی التھلکۃ - فقال :- ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ - وذلک مثل - والعرب تقول للمستسلم

ان تمام اقوال میں میرے نزدیک بہتر قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے.. اس کے معنی یہ ہیں کہ غلبۂ اسلام کے لئے اپنے دشمنوں سے۔ جو تمہیں خدا کے ساتھ کفر کرنے پر مائل کرتے ہوں جہاد کرو۔ اپنے آپ کو تہلکے میں ڈالنے کی ممانعت کی ہے، یہ ایک مثال ہے، جس شخص نے عاجز ہوکر تمام اپنے معاملات غیروں کو تفویض کردیے ہوں۔ محاورۂ عرب میں ایسے شخص کی نسبت کہتے ہیں کہ "وہ اُس نے فلاں کو اپنے ہاتھ دے دیے"، اسی طرح اُس شخص کی نسبت جو غیروں کو موقع دے کہ جو وہ چاہیں اُس کے ساتھ کریں۔

للامر" اعطی فلان بیدا یہ"
وکذلک یقال للممکن من نفسہ
مما ارید بہ" اعطی بیدا یہ"
فمعنی قولہ ولا تلقوا بایدیکم
الی التھلکۃ :- لا تستسلموا
للھلکۃ، فتعطوھا ازمتھا فتھلکوا
والتارک للنفقۃ فی سبیل اللّٰہ
عند وجوب ذلک علیہ مستسلم
للھلکۃ بترکہ اداۃ فرض اللّٰہ
علیہ فی مالہ [1]

محاورے میں کہینگے کہ اُس نے خود اپنا ہاتھ
دے دیا" اس بنا پر" اپنے ہاتھ سے ہلاکت
میں نہ پھنسو" کے معنی یہ ہوئے کہ" ہلاکت کے
آگے سر تسلیم خم نہ کرو اور اپنی عنان اختیار
اُس کے ہاتھ میں نہ دو، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے"،
جنلوگوں پہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا فرض ہو۔ اور وہ
اس کو ترک کر رہے ہوں۔ حقیقت میں وہ اس
فرض کو ترک کر کے ہلاکت کے آگے سر تسلیم
خم کر رہے ہیں۔

※ ※ ※ ※ ※ ※

یہ واضح روایتیں اور تشریحیں کسی وسیع نظر کی محتاج نہیں ہیں، محل نظر صرف یہ امر ہے کہ لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کے جو معنی آج بیان کیے جاتے ہیں صدرِ اول میں کوئی اُن کو جانتا بھی نہ تھا۔ رہی یہ بات کہ آشوبناک ابتلا کے نازک ترین وقتوں میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ اس کا جواب دینے والا خود قرآن ہے، سورۂ بقرہ میں ہے :-

ولقد نصرکم اللّٰہ ببدر وانتم
اذلۃ، فاتقوا اللّٰہ لعلکم تشکرون
اذ تقول للمؤمنین :- الن یکفیکم
ان یمدکم ربکم بثلاثۃ آلاف من
الملائکۃ منزلین، بلی ان تصبروا

خدا نے بدر میں تمھاری مدد کی تم اُس وقت
ذلیل و بے حیثیت تھے، لہذا خدا سے ڈرو،
شاید تم شکر گذار بن جاؤ، مسلمانوں سے اے
نبی! تم کہہ رہے تھے کہ" تمھیں اتنا کافی نہیں
کہ پھر تمھارا پروردگار تین ہزار فرشتے بھیجکر

---

[1] تفسیر ابن جریر۔ ج ۲۔ ص ۱۱۵۔

وتتقوا ویاتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسة الاف من الملائکة مسومین، وما جعله الله الا بشری لکم ولتطمئن قلوبکم به، وما النصر الا من عند الله العزیز الحکیم، لیقطع طرفا من الذین کفروا او یکبتھم فینقلبوا خائبین (۳-ع ۱۳)

تمہاری مدد کرے؟" ضرور کافی ہے، بلکہ تم اگر ثابت قدم رہو، تقویٰ کرو، اور دشمن بھی فوراً تم پر چڑھ آئیں۔ تو پروردگار پانچ ہزار شان و شکوہ والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ یہ امداد تو خدا کی صرف بشارت تھی جو اُس نے تم کو دی کہ تمہارے دل اس سے تسلی پائیں۔ اصلی مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہے، جو بڑا زبردست اور حکمت والا ہے۔ غرض یہ ہے کہ کسی قدر کافروں کی جڑ کاٹ دے یا ایسا ذلیل کرے کہ ناکام پلٹ جائیں۔

ایک مقام پر مسلمانوں کے اوصاف و خصائص کے تذکرے میں ہدایت کی ہے:-

الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم، فزادھم ایمانا، وقالوا حسبنا الله ونعم الوکیل، فانقلبوا بنعمة من الله وفضل لم یمسسھم سوء واتبعوا رضوان الله، والله ذو فضل عظیم، انما ذلکم الشیطان یخوف اولیاءه فلا تخافوھم، وخافون ان کنتم مؤمنین (۳-ع ۱۸)

ایماندار ایسے لوگ ہیں کہ جب لوگوں نے اُنکو خبر دی کہ "مخالفین نے تم سے مقابلے کے لئے ایک انبوہ اور بھیڑ جمع کر رکھی ہے، اُن سے ڈرتے رہنا" تو اس خبر سے اُن کا ایمان اور ترقی کر گیا اور بول اُٹھے کہ "ہم کو اللہ بس ہے، اور وہ بہترین کارساز ہے" یہ لوگ خدا کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے، اُنھیں کسی طرح کا گزند نہ پہونچا۔ خدا کی مرضی پر کاربند ہوئے، خدا کا فضل بڑا ہے، یہ شیطان ہے جو اپنے رفیقوں کو جنکے مزاج میں شیطنت ہوتی ہے ڈراتا رہتا ہے۔ تم اُن سے نہ ڈرنا، ایمان رکھتے ہو تو ہمارا ہی ڈر رکھنا

مسلمانوں کو کیا کیا ابتلا پیش آنے کو ہے؟ اس پیشین گوئی کے ذیل میں ارشاد ہوتا ہے:۔

لتبلون فی اموالکم وانفسکم، ولتسمعن من الذین اوتوا الکتٰب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذًی کثیرا، وان تصبروا وتتقوا فان ذٰلک من عزم الامور۔ (۳-ع ۱۹)

مسلمانو! جان و مال میں تمھاری آزمائش کی جائے گی، جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی جاچکی ہے (یعنی یہود و نصاریٰ) سے نیز مشرکین سے تم کو بہت سی ایذائیں سننی پڑینگی، تم اگر ثابت قدم رہو اور متقی بن جاؤ تو بے شک یہ ہمت کے کام ہیں۔

جو مسلمان ابتلا سے بچنے کے لئے کفار سے دوستانہ تعلقات بڑھانے کے درپے ہوں اُن کی بے راہ روی کی خبر دی ہے کہ:۔

فتری الذین فی قلوبھم مرض یسارعون فیھم، یقولون نخشی ان تصیبنا دائرۃ، فعسی اللہ ان یاتی بالفتح او امر من عندہ فیصبحوا علی ما اسروا فی انفسھم نادمین (۵-ع ۸)

تم دیکھو گے کہ جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے یہود و نصاریٰ سے ملنے میں وہ تیزی کریں گے اور کہینگے کہ "ایسا نہ کریں تو ہم کو خوف ہے کہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں"، کوئی دن جاتا ہے کہ خدا مسلمانوں کے لئے کشائش لاتا ہے یا اپنی طرف سے کوئی امر پیش دکھاتا ہے، اُس وقت یہ لوگ اُن امور پر (جنھیں اپنے دلوں میں چھپائے رکھتے تھے) پشیمان ہوں گے۔

ضعف و عجز و بے نوائی کے عالم میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئیے؟ اس باب میں قرآن کریم کا حکم یہ ہے:۔

وکاین من نبی قاتل معہ ربیون کثیر، فما وھنوا لما

کتنے پیغمبر ہو گزرے ہیں جن کی معیت میں بہت سے اللہ والے شریک جنگ ہوئے، اللہ کی راہ میں ان کو

اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصابرین، وما کان قولھم الا ان قالوا ربنا اغفر لنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین، فاٰتاھم اللہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الاٰخرۃ واللہ یحب المحسنین (۳-ع ۱۵)	جو مصیبت پہونچی اس کی وجہ سے نہ انھوں نے ہمت ہاری نہ ضعف و سُستی دکھائی، اور نہ عاجزی ظاہر کی۔ خدا اُنھیں کو دوست رکھتا ہے جو ثابت قدم رہتے ہیں۔ اس بات کے علاوہ اُنھوں نے اور کچھ نہ کہا کہ "پروردگار! ہمارے گناہ معاف کر، ہمارے کاموں میں جو زیادتیاں ہم سے ہوگئی ہیں اُن سے درگذر فرما ہمیں ثابت قدم بنائے رکھ، اور گروہ کفار پر ہمکو فتح دے"۔ خدا نے اُن کو دنیا میں بھی بدلہ دیا، اور آخرت کے نیک بدلے کا کیا پوچھنا ہے، اور احسان کرنیوالے ہی پسندیدۂ جناب الٰہی ہیں۔

کفار کی غلامانہ و کورانہ اطاعت میں مسلمانوں کی فلاح ہے یا نہیں؟ تعلیمات الٰہی میں اس کی یوں شرح کی گئی ہے:-

یا ایھا الذین اٰمنوا ان تطیعوا الذین کفروا یردوکم علی اعقابکم فتنقلبوا خاسرین، بل اللہ مولٰکم وھو خیر الناصرین (۳-ع ۱۶)	مسلمانو! تم اگر کافروں کی اطاعت کروگے تو وہ تمھیں بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے لوٹا کر لے جائینگے، پھر اس رجعت قہقری درفتار معکوس میں تم ہی خسارہ اُٹھاؤگے، وہ تمھارے

خیر خواہ نہیں، بلکہ تمھارا خیر خواہ تو خدا ہے، اور تمام مددگاروں سے بہتر مددگار وہی ہے۔

ان آیتوں کا ماحصل یہ ہے:-

(۱) ذلت دلیل ناکامی نہیں ہے۔ مسلمان کیسے ہی بے برگ و بے نوا ہوں لیکن اسلام کی بو اُن میں باقی ہے، تو خدا خود اُن کی مدد کرے گا۔ یہ امداد فرشتوں کی صورت میں بھی نازل ہوسکتی ہے۔ خواہ یہ فرشتے عام مفسرین کی رائے کے مطابق

سچ مچ کے فرشتے ہوں یا مشہور مفسّر (ابو بکر اصم) کے انکار کو تسلیم کرتے ہوئے ان کو روحانی تسلی و اطمینان قلب کا مرادف سمجھا جائے (تفسیر کبیر ج ۲ ۔ ص ۲۵۵)

معمولی امداد کے علاوہ :۔

(الف) مسلمان اگر ثابت قدم رہیں

(ب) اسلامی کیریکٹر (تقویٰ) اُن میں موجود ہو۔

(ج) جو حالت اس وقت ہے کہ ہر طرف سے کفار نے مسلمانوں کو نرغے میں لے لیا ہے اسی کیفیت سے کافروں کا انبوہ چڑھ دوڑے ، تو ان حالتوں میں تقویت اسلام کے لئے شاندار آسمانی امداد کے منتظر رہو ، لیکن یہ خصوصیتیں مفقود ہوں تو ذلت و مسکنت سے رہائی کی آرزو ہی بے محل ہے ۔ خدا خود چاہتا ہے کہ ایک حد تک کفار کا استیصال ہو ، اور اُن کی ترقی رک جائے ۔ اس مشیّت کی تکمیل کیلئے وہ تو آمادہ ہے مگر ہم بھی تو اپنی آمادگی کا ثبوت دیں ۔

(۲) مسلمانوں کا یہ شن نہیں ہے کہ کفار کے انبوہ سے خوفزدہ ہو جائیں ، غلبۂ کفر میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اُن کے ضعف و استکانت سے فائدہ اُٹھا کر انھیں مرعوب کر دے ، نرغۂ کفار کی حالت میں اُن کی قوت ایمانی میں اور بھی ترقی ہونی چاہئے ، خدا پر بھروسا کر کے اگر مقاومت کو اُٹھ کھڑے ہوئے تو کامیابی میں کیا کلام ہے ؟ مضرت پہونچ سکتی نہیں ، ضرر رسانی کی قدرت معدوم ، حسن انجام متحتم ، البتہ مرضات الٰہی کا اتباع مشروط ہے ، شیطان خوف دلاتا ہے ، بندگانِ خدا اُس سے کیوں ڈریں ؟ کافروں کی جمعیت تو خوف کی چیز نہیں ہے ، اُن سے بیم و ہراس ہی کیا ؟ دل میں ایمان ہے تو صرف خدا سے ڈرنا چاہئے ، ایماندار دل اور کفار کا خوف ! نقیضیں بھی کہیں جمع ہوئی ہیں ؟

(۳) ابتلا سے مفر نہیں ، جان و مال کا نقصان اُٹھانا ہوگا ، اہلِ کتاب سے

جن میں دوسری صدی ہجری سے آج تک نصرانیوں کو خاص امتیاز حاصل ہے، اور مشرکین سے، کہ نصرانیت میں اُس کی بھی کمی نہیں، بہت سی اذیتیں برداشت کرنی پڑیں گی، ان حالتوں میں اگر مسلمان ثابت قدم رہے، استقلال کی خصوصیت کھو نہ بیٹھے، اور تقویٰ و طہارت نفس کے اسلحہ اُن کے ہاتھ میں ہوئے، تو پھر حوصلے کیوں پست ہونے لگے، اور من بعد غلبھم سیغلبون (مغلوبیت کے بعد وہ بہت جلد غالب ہوں گے) کا وعدہ زیادہ دیر تک وفا کا زحمت کش انتظار کب رہنے لگا ؟

یثبت اللہ الذین اٰمنوا بالقول الثابت فی الحیاۃ الدنیا و فی الاخرۃ و یضل اللہ الظالمین و یفعل اللہ ما یشاء (۱۴-۲۰)

جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کو قول ثابت یعنی توحید کی برکت سے دنیا کی زندگی میں بھی خدا ثابت قدم رکھیگا، اور آخرت میں بھی، اور جو لوگ ظالم ہیں خدا اُنکی راہ گم کردیگا، خدا جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے

(۴) کفار سے مسلمانوں کو ساز و باز نہ رکھنا چاہیئے، اُن سے بے تعلقی لازم ہے جو ساز و باز رکھتے ہوں، جنھیں اُن سے بے تعلق رہنے میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مشکلات و مصائب کا اندیشہ ہو، وہ غلطی پر ہیں، اُن کو پشیمان ہونا پڑے گا تا اسلام کو فتح نصیب ہوگی، یا مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرت کاملہ کوئی اور انتظام کردے گی، اُس وقت معلوم ہوگا کہ الاٰن قد ندمت ولا ینفع الندام (تم اب نادم ہوئے جبکہ ندامت مفید ہی نہ رہی) کے کیا معنی ہیں۔

(۵) مسلمان کیسی ہی افسوسناک کمزوریوں کے ابتلا میں گرفتار ہوں، کیسا ہی تنزل و انحطاط ضعف و تذلل اُن پر محیط ہو، مگر جب مقابلے کو اُٹھینگے یہ ظاہری کمزوریاں اُن کو مغلوب نہیں بناسکتیں، وہ عزم و ثبات

سے کام لینگے، خدا پر بھروسا کرینگے، استقلال و نصرت کے خواستگار ہونگے اور ایمان و عمل صالح کی طاقت سے نفس مطمئنہ کی ہمت بڑھاتے ہوئے فنائے استبداد کے لئے بڑھیں گے، اُن کی دنیا بھی سنور جائے گی، اور انجام بھی اچھا ہی ہوگا۔

(۶) کفار کی متابعت خود انحطاط و تنزل کا ذریعہ ہے۔ طغیان کفر و استبداد کی مطیع رہ کر مسلمان قومیں ترقی کر سکتی ہی نہیں۔ مسلمانوں پر صرف خدا کی اطاعت فرض ہے، اُسی سے نصرت کی توقع رکھنی چاہئے، اور اکیلے ایک اُسی کو مددگار سمجھنا چاہیئے، دنیا کی جھوٹی ہستیاں کسی اور کو نفع پہنچائیں تو پہنچائیں مگر مسلمان تو ان سے کبھی منتفع نہیں ہو سکتے۔

یہ تعلیمات الٰہیہ کسی خاص وقت اور زمانے کے لئے مخصوص نہیں، ان کی عمومیت ہر عہد اور ہر قوم پر حاوی ہے، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کے وہی معنی ہیں جو آج لئے جاتے ہیں، اور جن سے ہمتیں اور بھی پست ہوتی جاتی ہیں۔



وقت ست آنکہ وقت بر سر آید

کشف ساق سے قرآن کا مدعا کیا ہے؟

جس وقت کا کھٹکا تھا وہ وقت آگیا آخر، قدرت کاملہ نے اسلام پر کفر کے غالب ہونے کے جو علامات بتائے تھے، ایک ایک کر کے سب پورے ہو رہے ہیں، ارباب اقتدار ہم سے مداہنت کے خواہشمند ہیں اور ہم اُن کی غرض پوری کرتے ہیں، وہ قسمیں کھاتے ہیں، حلف اُٹھاتے ہیں، قانون بناتے ہیں، مذہبی احترام کا پیغام سُناتے ہیں کہ عبادت گاہیں قائم رہینگی، عبادتیں قائم رہینگی، شعائر اللہ قائم رہیں گے، مگر کوئی ایک چیز بھی قائم نہیں رہنے پاتی۔ قول و قرار کرتے ہیں، ہر بار اُس کا اعادہ کرتے ہیں، اور ہر موقع پر اُس کو یاد دلاتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ یہ وعدے وفا ہونے والے نہیں، یہ عہد ٹوٹنے کے لئے باندھے گئے ہیں، یہ قانون فسخ و ترمیم کے لئے بنا ہے، یہ اعلان اخفائے حقیقت کے لئے ہوا ہے، اس اقرار سے ضرورت کے وقت انکار کی ادائیں بھی نکل سکتی ہیں، سب کچھ ہے، مگر اسپر بھی ہم اُن پر اعتماد کرتے ہیں، اُنکی بات مانتے ہیں، اُن کا حکم مانتے ہیں، اُن کی اطاعت کرتے ہیں، اور اُن کی خاطر سے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ واقعات و حوادث کی جو لوگ صریح تکذیب کرتے ہوں، منع خیر پر آمادہ ہوں، تعدی و تطاول میں حد سے بڑھ گئے ہوں، احکام اسلام کو پُرانے ڈھکوسلے سمجھ رہے ہوں، چاہتے ہوں

کہ تمام دنیا پر انھیں کا تسلط بیٹھ جائے، سارا زمانہ انھیں کا حلقہ بگوش رہے، اور تسلط واقتدار کے دائرے سے کوئی غریب مسکین آبادی بھی مستثنےٰ نہ رہنے پائے ایسے لوگوں کی اطاعت ممنوع ہے۔ اور اگر ہم خود اس حکم کی اطاعت کریں گے تو ہمارا بھی وہی حشر ہونے والا ہے جو ان سرکشوں کا ہوگا۔

خطرات فراہم ہو رہے ہیں، دل بندھ رہا ہے، گھٹائیں چھا رہی ہیں، مطلع مکدر رہے، کڑک اور کوندے کی پیشینگوئی سننے والے کان بہرے ہو گئے ہیں، طوفان احساس کو روکنے کے لئے آگ اور تلوار سے بند باندھے جا رہے ہیں، جذبات کا اظہار معصیت ہے، جرم ہے، گناہ ہے، اکبر الکبائر ہے، وہ پاک ہستیاں محل نقد میں کیونکر آسکتی ہیں جن کے رنگ و روغن خون میں نہا نہا کے نکھرے ہیں، وہ جو کہیں حق ہے، جو کریں عدل ہے، من حیث خرجت فول وجھك شطرھم ولا تکن اول کافر بھم۔

آنے والی خطرناک گھڑی کی ساقیں کھل چکی ہیں، بصارتیں جھک گئی ہیں اب چہروں پر ذلت کا چھا رہنا باقی ہے، "سن لیجیؤ کہ وہ بھی مساوات ہوگئی" یہ کوئی فرض وحدس یا ظن وتخمین کی باتیں نہیں ہیں انکی پیش خبری خود کلام الٰہی میں موجود ہے، سورۂ قلم میں ہے:۔

فستبصر ویبصرون، بایکم المفتون؟ ان ربك ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین	عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور یہ کفار بھی دیکھ لیں گے کہ تم دونوں فریقوں میں کونسا فریق مخبوط ہے؟ بے شک تمھارا پروردگار ہی اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے جو اُسکے رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں، اور وہی اُن لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو راہِ راست پر ہیں۔
فلا تطع المکذبین، ودّوا	تم جھٹلانے والوں کی اطاعت نہ کرنا۔ نہ اُن کے

لو تدھن فیدھنون، ولا
تطع کل حلاف مھین، ھماز
مشاء بنمیم، مناع للخیر
معتد اثیم، عتل بعد
ذلک زنیم، ان کان ذا
مال وبنین، اذا تتلی علیہ
آیاتنا قال اساطیر الاولین
سنسمہ علی الخرطوم،

کہے میں آجانا، وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ تم مداہنت کرو اور ڈھیل دو تو وہ بھی ملائم پڑجائیں، خبردار! تم کسی ایسے کی اطاعت نہ کرنا، اور نہ اُس کی بات ماننا، جو بہت ساری قسمیں کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے، لوگوں پر آوازے کسا کرتا ہے، چغلیاں لگاتا پھرتا ہے، اچھے کاموں سے لوگوں کو روکتا ہے، حد سے بڑھ گیا ہے، بدکار ہے، اکھڑ ہے، اور ان عیوب کے علاوہ بد اصل بھی ہے، اس بنا پر کہ وہ مال و اولاد والا ہے، جب ہماری آیتیں اُسکو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ "یہ تو اگلے لوگوں کے ڈھکوسلے ہیں" اچھا دیکھو تو! ہم عنقریب اُس کے ناک پر داغ لگائینگے۔

انا بلوناھم کما بلونا اصحاب
الجنۃ، اذ اقسموا لیصرمنھا
مصبحین، ولا یستثنون،
فطاف علیھا طائف من
ربک وھم نائمون،
فاصبحت کالصریم،

جس طرح ہم نے ایک باغ والوں کو آزمایا تھا اُسی طرح ہم نے ان کافروں کی بھی آزمائش کی ہے، اُن باغ والوں نے قسمیں کھائی تھیں کہ "صبح ہوتے ہی ہم اُسکے میوے ضرور توڑینگے، اور اس میں کوئی استثنا بھی نہ ہونے پائیگا" وہ سوتے کے سوتے ہی رہے کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے باغ پر ایک ایسی بلا چھا گئی کہ صبح ہوتے ہوتے وہ بالکل ہی خالی رہ گیا، جیسے کوئی سارے میوے توڑ لے گیا ہو،

فتنادوا مصبحین، ان اغدوا
علی حرثکم ان کنتم صارمین،
فانطلقوا وھم یتخافتون
ان لا یدخلنھا الیوم علیکم

سویرے جب وہ لوگ اُٹھے تو ایک دوسرے کو آواز دی کہ "تم کو میوے توڑنے ہیں تو اُٹھو! تڑکے سے باغ میں جا پہنچو" لوگ اُٹھے اور چل کھڑے ہوئے آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ "دیکھنا! آج

مسکین،	کوئی غریب آدمی باغ کے اندر تمھارے پاس آنے پائے"۔
وغدوا علی حرد قادرین،	غرض یہ سمجھکر کہ بس اب جاتے ہی سارے میوے توڑ
فلما راوھا، قالوا:۔ انّا	لینگے ساز و سامان سے چلے اور سویرے پہونچ گئے،
لضالون، بل نحن محرومون	باغ کو جب دیکھا کہ اُجڑا پڑا ہے تو کہنے لگے کہ "معلوم
قال اوسطھم الم اقل	ہوتا ہے ہم راستہ بھول گئے، نہیں راستہ تو یہی ہے
لکم لولا تسبحون؟ قالوا	ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی" آخر اُن میں جو شخص
سبحان ربنا انا کنا ظالمین	سب سے اچھا تھا اُس نے کہا کہ "میں تم سے کہتا نہ تھا

کہ خدا کی تسبیح و تقدیس کیوں نہیں کرتے؟" ناچار سب کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ "ہمارا پروردگار پاک ہے۔ ہمیں ظالم تھے"

فاقبل بعضھم علی بعض	یہ سب ہو چکا تو اُن میں ہر ایک شخص دوسرے کے مُنہ
یتلاومون، قالوا یاویلنا	پر ملامت کرنے لگا کہ "افسوس! ہمیں حد سے بڑھ گئے
انا کنا طاغین، عسی ربنا	تھے، شاید ہمارا پروردگار اسکے بدلے کوئی اس سے
ان یبدلنا خیرا منھا، انا الی	اچھا باغ ہمکو عنایت کرے، اب ہم اپنے پروردگار
ربنا راغبون،	ہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں"
کذلک العذاب، ولعذاب	ظالموں پر ایسا ہی عذاب اُترتا ہے، اور انجام کار جو عذاب
الآخرۃ اکبر، لوکانوا یعلمون	نازل ہونے والا ہے اگر اُس کی حقیقت جان لیں تو

معلوم ہوگا کہ وہ اس سے بھی بڑا اور بہت بڑا عذاب ہے۔

ان للمتقین عند ربھم جنات	جن لوگوں میں تقویٰ (اسلامی کیرکٹر) ہے ان لوگوں کے
النعیم،	لئے بیشک اُن کے پروردگار کے پاس نعمت اور برکت والے باغ ہیں
افنجعل المسلمین	کیا ہم مسلمانوں کو گناہگاروں کے برابر کر دیں گے؟
کالمجرمین؟ مالکم کیف	تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کیسے حکم لگایا کرتے ہو؟

تحکمون؟ ام لکم کتاب فیه تدرسون ان لکم فیه لما تخیرون؟ ام لکم ایمان علینا بالغة الی یوم القیٰمة ان لکم لما تحکمون؟ سلهم ایهم بذلک زعیم؟ ام لهم شرکاء؟ فلیاتوا بشرکاءهم ان کانوا صادقین؟

کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں پڑھتے ہو کہ جو تم پسند کروگے وہی تمھیں ملیگا؟ یا تم نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں جو روز قیامت تک چلی جائینگی کہ تم جس چیز کی فرمائش کروگے وہی تمھارے لئے موجود کر دیجائیگی؟ ان لوگوں سے پوچھو کہ ان میں کون اس کا ذمہ دار ہے؟ کیا ان لوگوں کے اور بھی شرکائے خدا ہیں؟ اگر ہیں اور یہ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو لائیں حاضر کریں؟

یوم یکشف عن ساق و یدعون الی السجود فلا یستطیعون، خاشعة ابصارهم ترهقهم ذلة وقد کانوا یدعون الی السجود وهم سالمون،

وہ دن آنے والا ہے جب کہ ساق کھلیگی اور ان لوگوں کو سرفگندگی کی دعوت دی جائے گی، مگر اُس وقت انہیں اتنی قدرت و استطاعت کہاں؟ اُن کی آنکھیں جھکی ہونگی صورتوں پر ذلت چھا رہی ہوگی، یہ وہی لوگ ہیں کہ پہلے جب انھیں سر جھکانے کو کہا جاتا تھا تو اُس وقت یہ چنگے خاصے صحیح و سالم تھے۔

فذرنی ومن یکذب بهذا الحدیث، سنستدرجهم من حیث لا یعلمون، و املی لهم ان کیدی متین

ہم کو اور ان لوگوں کو جو اس کلام کو جھٹلاتے ہیں، اپنے حال پر رہنے دو، ہم اس طرح پر کہ انھیں خبر بھی نہو آہستہ آہستہ ان کو گھسیٹتے اور ڈھیل دیتے چلے جا رہے ہیں، بیشک ہماری تدبیر نہایت پختہ و محکم ہے۔

ام تسألهم اجرا فهم من مغرم مثقلون؟ ام عندهم الغیب فهم یکتبون؟

یہ بات کیا ہے؟ یہ اس قدر سرگراں کیوں ہیں؟ کیا تم ان سے کسی بات کی اُجرت مانگتے ہو کہ اُس کے تاوان سے یہ دبے جا رہے ہیں؟ یا ان کے پاس غیب کی

فاصبر لحکم ربک ولا تکن کصاحب الحوت اذ نادیٰ وھو مکظوم، لولا ان تدارکہ نعمۃ من ربہ لنبذ بالعراء وھو مذموم، فاجتباہ ربہ فجعلہ من الصالحین، (۶۸-۲-۲۷)

خبریں آتی ہیں اور یہ اُن کو لکھ لیا کرتے ہیں؟ بہرحال تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں ثابت قدم بنے بیٹھے رہو اور اُس مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے مغموم ہو کر خدا کو آواز دی تھی، پروردگار عالم کا فضل و کرم اگر اُس کی دستگیری نہ کئے ہوتا تو بڑے بُرے حالوں فضائے زمین پر پھینکا ہوا پڑا رہتا، لیکن پروردگار کو بندہ نوازی منظور تھی، اُس نے نوازش کی اور پھر اپنے صالح بندوں میں (جو نیک و بہتر زندگی بسر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں) اُس کو شامل کر لیا۔

(۱)

کشف ساق (پنڈلی کھولنے) کی تشریحی کیفیت کیا ہے؟ روایت میں ہے:

(۱) قیامت کے دن مخلوقات کے روبرو خدا ممثل ہوگا، مسلمان سامنے سے گزرینگے، سوال ہوگا۔ تم کس کی عبادت کرتے ہو؟ کہینگے خدا کی، خطاب ہوگا۔ تم خدا کو پہچانتے ہو؟ کہینگے۔ پہچنوائیگا تو کیوں نہ پہچانینگے، یہ سنکر خدا اپنی ساق کھولدیگا، جتنے مسلمان ہونگے دیکھتے ہی سجدے میں سر جھکا دینگے، منافقین کا گروہ سر جھکانا چاہیگا تو پیٹھ سخت ہو جائے گی، یہ فرق امتیازی مسلمانوں کو منافقوں سے متمائز کر دے گا۔[۱]

(۲) قیامت کے دن کفار و مشرکین کے روبرو اُن کے بُت لائے جائینگے کہ دیکھو تم انھیں کو پوجتے تھے، اب انھیں کے ساتھ جاؤ دوزخ میں جلو، پھر مسلمانوں کی نوبت آئے گی۔ خدا اپنی ساق اُن کے لئے کھول دیگا، سب کے سر جھک جائینگے،

---

[۱] محمد بن بشار قال ثنا سفیان عن سلمۃ بن کہیل قال ثنا ابو الزہراء عن عبد اللہ قال یتمثل اللہ للخلق یوم القیامۃ الخ۔

منافقین سجدہ نہ کر سکینگے اس لئے جہنم میں گھر بسائینگے ؎۱

(۳) اہل قیامت خدا کے روبرو چالیس برس تک ٹکٹکی باندھے کھڑے رہینگے، برہنہ سر، برہنہ پا، برہنہ جسم، غرق عرق، چالیس برس تک اسی عالم میں رہینگے مگر کوئی بات تک نہ کریگا۔ آخر میں خدا کی ساق کھل جائے گی۔ اور پیشانیاں وقف سجود ہو جائینگی ؎۲

(۴) قیامت میں منادی ہوگی کہ ہر گروہ اپنے اپنے سرگروہ کے ساتھ ہولے بت پرست بتوں کے ساتھ، باطل پرست اپنے اپنے بے حقیقت پیشواؤں اور دیوتاؤں کے ساتھ ہو لینگے، اور سب آگ میں جھونکے جائینگے، خاصان بارگاہ جب باقی رہینگے تو خدا اپنی صورت بدلدیگا، ساق کھل جائیگی، اور منافقین کے علاوہ تمام اہل اسلام سربسجود ہو جائینگے ؎۳

الغرض روایتوں میں اُس عجیب و غریب پل (صراط) کا تذکرہ بھی ہے جو تلوار

؎۱ یحییٰ عن طلحۃ الیربوعی قال ثنا شریک عن الاعمش عن المنہال بن عمرو وعن عبد اللہ بن مسعود قال الخ۔

؎۲ ابو کریب قال ثنا الاعمش عن المنہال بن قیس بن سکن قال حدث عبد اللہ وھو عند عمر یوم یقوم الناس لرب العالمین قال الخ

؎۳ موسیٰ بن عبد الرحمٰن المسروقی قال ثنا جعفر بن عون قال ثنا ہشام بن سعد قال ثنا زید بن اسلم عن عطاء بن یسار عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان یوم القیامۃ الخ۔

وھذہ الروایات بعضھا واھیۃ وبعضھا من ضعاف الاخبار لا شیئ منھا حقیقۃ ولا یسمن ولا یغنی من جوع، وقد اکتفینا علی سرد مصادرھا حاذفا للفضول واللہ یقول الحق و ھو یھدی السبیل۔

سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ پتلا ہوگا، جہنم کے زبانے شرر افشاری کر رہے ہونگے، آگ کا دریا لہریں مار رہا ہوگا، یہ پل اسی کے وسط میں ہوگا جسکو عبور کرتے کرنے پر باغ بہشت کی فضا ملیگی، تاریکی قیامت کی محیط ہوگی، اس عالم میں پل پر سے گزرنا پڑے گا، جو ایماندار ہوں گے وہ تو انوار آلھیہ کی روشنی میں اس مسافت کو طے کرینگے، مگر اہل کفر کے لئے روشنی کہاں؟ من لم یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نور، بے چارے پل پر سے کٹ کٹ کے گرینگے اور دوزخ میں پڑینگے۔

اسلام کے علمی زمانے میں ان روایتوں کے اخذ ورد میں کافی بحث ہو چکی ہے لیکن جب روایتیں ہی سرے سے مقطوع الاسانید ہوں، متہم الوضع ہوں، بدیہی البطلان ہوں، صدوق وثقہ رواۃ نہ رکھتی ہوں، تو اُن کو روایت سمجھنا اور اُن سے استدلال کرنا ہی غلط ہے، خوش فہموں کو اسلام پر اعتراض کرنے کے لئے اگر انھیں روایتوں کا سہارا ہے، تو اہل نظر کو جواب دینا کیا ضرور ہے؟

گو تو خوش باش کہ ما گوش بہ احمق نہ کنیم

(۲)

کشف ساق کے الفاظ ادبیات عرب میں کس معنی کے لئے استعمال ہوتے ہیں؟ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے پہلے دو خاص مقدمے ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔

(۱) ہر زمانے، ہر ملک، ہر قوم اور ہر زبان کے خاص خاص محاورے ہوتے ہیں، روحانیت کے ساتھ کمال اتصال کو تورات کے محاورے میں خدا سے لڑنے اور کشتی کرنے سے تعبیر کرتے ہیں، قرآن ترحم واشفاق کو آسمان کا رونا کہتا ہے، اُردو میں انکار کے لئے کانوں پر ہاتھ رکھنا مستعمل ہے، حریفوں کو پامال کرنے کے لئے ایران کے قدیم محاورے میں "دشمن گزائی" کا استعمال

تھا، اعتلا روا قدام کے لئے "باز و برا فراختن" کہتے تھے، وتخوذ الک، ان سب میں محاورے کے اطلاق کو دیکھتے تھے، الفاظ کے اصلی معنی سے بحث نہ تھی

(۲) اسلوب تعبیر کی دو حیثیتیں ہیں (الف) حقیقت (ب) مجاز۔ محل حقیقت و مجاز میں مختلف مناسبتیں ہوا کرتی ہیں، جن سے ایک ہی لفظ جو پہلے کسی اور معنی کے لئے مستعمل تھا اب ایک جداگانہ معنی میں استعمال ہو سکتا ہے، قرآن کریم ایک خاص مقام پر کہہ رہا ہے:۔

مایکون من نجوی ثلاثۃ الا ھو	جہاں کہیں تین شخص گرم راز و نیاز ہوں وہاں
رابعھم ولا خمسۃ الا ھو	اُن کا چوتھا خدا ہے، پانچ ہوں تو اُن کا چھٹا
سادسھم، ولا ادنی من ذالک	شریک خدا ہے اس سے کم یا زیادہ جس تعداد
ولا اکثر الا ھو معھم (۵۸۔ع ۲)	میں بھی ہوں خدا اُن کے ساتھ ہے۔

یہ حقیقت اس مجاز سے وابستہ تھی کہ تین ہم صحبتوں کا چوتھا شریک اور پانچ شرکائے مجلس کا چھٹا جلیس اُن کے مکالمہ سے آگاہ ہوتا ہے، اُن کی راز داریاں اُس پر منکشف ہو سکتی ہیں، اور وہ اُن کے خفایائے امور کو سن اور سمجھ سکتا ہے، آیت کا بھی یہی مدعا تھا، اور اس کے لئے اس سے بہتر اسلوب ممکن نہ تھا۔

ایک دوسری آیت میں ہے:۔

واعلموا ان اللہ یحول بین	خوب جان رکھو کہ انسان اور اُسکے دل کے مابین
المرء وقلبہ (۹۔ ع ۳)	خدا حائل ہو جایا کرتا ہے۔

دل اور جسم کے مابین حائل ہونے والے سے بڑھ کر اور کون ہے جسے مخفی نیتوں کا حال معلوم ہو سکے؟ یہاں بھی جناب الٰہی کی یہی غرض تھی۔ لہذا حقیقت اس مجاز کے لباس میں نمودار ہوئی۔

ایک اور موقع پر ہے:۔

واللہ لا یستحیی من الحق (۳۳-ع ۷) خدا کو اظہار حق میں کوئی شرم نہیں

شرم (حیا) کی حقیقت یہ ہے کہ طبیعت میں ایک ایسا انکسار و انفعال پیدا ہو کہ ارتکاب قبائح سے نفس کو روک دے، ظاہر ہے کہ شان الوہیت اس حقیقت سے نہایت ارفع ہے، لیکن تجوز کے لئے یہاں ایک مجازی مناسبت موجود تھی یعنی شرمیلی طبیعتیں جس چیز سے حیا کرتی ہیں اُس کو ترک کر دیا کرتی ہیں، اس طریق تعبیر کو لیکر قرآن نے بتایا کہ شرم کرنے والے تو شرم کی بات کو ترک کر دیتے ہیں، مگر خدا کی بارگاہ اس سے بہت پرے ہے، وہاں حقیقت حیا کی سمائی نہیں کہ حیا کرنے والوں کی طرح وہ بھی اظہار حق کو چھوڑ بیٹھتے۔

ایک مشہور آیت ہے:-

الرحمٰن علی العرش استویٰ (۲۰-ع ۱) خدا تخت پر کھڑا ہوا۔

کھڑے ہونے (استواء) کی حقیقت میں استیلاء کا مجاز مضمر تھا، اب بھی محاورے میں کہتے ہیں:- بلغاریا کا تخت متزلزل ہو گیا، یعنی اُس کے استیلاء میں ضعف آگیا، پہلی صدی کا ایک عرب شاعر کہتا ہے:-

قد استوی لبشر علی العراق من غیر سیف و دم مھراق

عہد اموی کا رکن سلطنت (امیر لبشر) عراق کے تخت پر کھڑا ہو گیا۔ بغیر اس کے کہ تلوار چلائے یا خون بہائے۔

قرآن کو بھی یہ حقیقت اسی مجاز کے اسلوب میں نمایاں کرنی تھی۔

سورۂ رحمان کی ہیبت ناک وعید ہے:-

سنفرغ لکم ایھا الثقلان اے دونوں جماعتو! ہم عنقریب تمھارے لئے خالی ہو کر فراغت کیا چاہتے ہیں۔

فارغ ہونے اور خالی ہو بیٹھنے کی حقیقت اس مجاز نے منفتح کر دی کہ جن لوگوں

کے مشاغل کثیر ہوتے ہیں وہ کوئی خاص مہتم بالشان کام کرنا چاہیں تو اس مشغولیت کے عالم میں خاطر خواہ نہ کر سکینگے، اسکے لئے اُنھیں ایک مخصوص وقت نکالنا ہوگا، مفہوم کو دل نشیں بنانے کے لئے قرآن کریم نے بھی اس تجویز کو لے لیا کہ لوگو! خبردار رہو، تمھارا احساب کرنے کے لئے ہم عنقریب ایک خالی وقت نکالنے کو ہیں کہ اچھی طرح محاسبہ ہو اور کافی امتحان واختبار ہوجائے۔

(۲۳)

کشف ساق سے مراد کیا ہے؟ علامہ ابن جریر اسکا جواب دیتے ہیں:

قال جماعۃ من الصحابۃ و	مفسرین صحابہ و تابعین کی ایک جماعت کا
التابعین من اھل التاویل	قول ہے کہ آیت "وہ دن جب ساق کھلیگی"
یبدا (من امر شدید... وکان	کے معنی یہ ہیں کہ امر شدید ظاہر ہوگا.....
ابن عباس یقول کان اھل الجاھلیۃ یقولون	عبداللہ بن عباس اس کی مثال میں کہا کرتے
کشفت الحرب عن ساقہ.... وعن عکرمۃ	تھے "عہد جاہلیت کا محاورہ تھا کہ جنگ نے
فی قولہ یکشف عن ساق، قال	اپنی ساق سے ازار کو اٹھالیا" یعنی پوری
ھو یوم کرب، وذکر عن ابن عباس	طرح لڑائی چھڑ گئی..... عکرمہ سے بھی
انہ کان یقرء ذلک:۔ یوم نکشف	اس آیت کی تفسیر میں یہی روایت ہے کہ
عن ساق، بمعنی یوم نکشف	وہ دن کرب و سختی کا دن ہوگا، ابن عباس
القیامۃ عن شدۃ شدیدۃ،	اس آیۃ کو یوں بھی پڑھتے تھے کہ "وہ دن جب
والعرب تقول کشفت ھذا	ہم ساق کھول دینگے" یعنی بڑی سختی برپا کرینگے
الامر عن ساق اذا صار الی شدۃ[۲]	جب کوئی بات نہایت سخت ہوجاتی ہے تو

[۱] تفسیر ابن جریر۔ ج ۲۹۔ ص ۲۱

[۲] ابن جریر۔ ص ۲۴۔

اہل عرب کہتے ہیں "اس بات کی ساق کھل گئی۔

عز بن عبدالسلام لکھتے ہیں :-

هو مجاز عن مبالغته في حساب اعدائه واهانتهم وخزيهم وعقوبتهم، فان العرب يقولون لكل من جد في امر وبالغ فيه كشف عن ساقه، واصله ان من جد في عمل من الاعمال، حرب او غيرها، فانه يشمر ازاره عن ساقه كيلا يعوقه عن جده وسرعة حركته فيما جد فيه [۱]

آیت کے معنی مجازی ہیں، مراد یہ ہے کہ دشمنانِ خدا کے محاسبہ و تذلیل و رسوائی و تعذیب میں مبالغہ ہوگا، جب کوئی شخص کسی کام میں نہایت مبالغے کے ساتھ کوشش کرتا ہے تو اہل عرب کہتے ہیں "اُس نے اپنی ساق کھولدی" اس کی اصلیت یوں ہے کہ جب کوئی شخص کسی بڑے کام میں سرگرم ہوتا ہے، خواہ جنگ ہو یا کوئی اور کام ہو، تو ازار کو اوپر چڑھا لیتا ہے کہ تیزی و سرگرمی کے ساتھ جو کام کرنا چاہتا ہے اُس میں حرج واقع نہو۔

اس تشریح نے یہ حقیقت بھی واضح کردی کہ حدیث میں دامن جھاڑتے ہوئے چلنے کی نسبت جو وعید وارد ہے کہ: من جرازاره بالخيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة (جو شخص غرور و تکبر سے تہبند کے دامن جھاڑتے ہوئے چلیگا قیامت میں خدا اُس کی جانب ملتفت نہوگا) کا مفہوم اس مبالغت ہی پر حاوی نہیں ہے کہ تہبند یا عبائیں یا پاجامے اس قدر نیچے نہ پہننے چاہئیں کہ موریاں قدم تک کو چھپالیں اور زمین پر لوٹتی چلیں، بلکہ اس کے ساتھ یہ مدعا بھی مضمر ہے کہ مسلمان کو مغرور نہ ہونا چاہئے اور نہ فرطِ غرور سے اُسکے لئے غافل رہنا زیبا ہے، خدا کتنی ہی دولت دے، کیسی ہی ثروت

۱ الاشارة الى الايجاز في بعض انواع المجاز طبع قسطنطنیہ سنہ ۱۳۱۳ھ - ص ۱۱ -

ملے، کتنی کچھ منزلت بلند ہو، مگر اُس کو ہر حال میں ہوشیار رہنا لازم ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں مشکلیں پیش آنے والی ہوں وہ اُن کے حل کرنے کے لئے پہلے سے آمادہ و مستعد رہے۔ عہدِ جاہلیت کے مشہور سخن سنج (درید بن الصمہ) کے کلام میں یہی مفہوم مخفی ہے:۔

کمیش الازار خارج نصف ساقہ

ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اہلِ عرب جن کو ارتداد گوارا تھا، ترکِ ملک و مال گوارا تھا، ورۂ عمر یہ کا مقابلہ گوارا تھا، مگر تہ بند کا ٹخنے کے اوپر رکھنا گوارا نہ تھا وہ نصف ساق کے تہ بند پہنتے رہے ہونگے؟

(۴)

مزید تشریح کے لئے مسئلے کو یوں سمجھنا چاہئے:۔

(الف) بے شبہ خدا کے ساق نہیں ہے، لیکن جنگ کے بھی تو ساق نہیں ہے، بایں ہمہ اہلِ عرب کہتے ہیں:۔

کشفت لھم عن ساقھا   وبدا من الشر الصراح

(جنگ نے اُن لوگوں کے روبرو اپنی ساق کھول دی اور صاف و صریح خطرہ نمایاں ہوگیا)

(ب) خطرے کے دانت بھی نہیں ہوتے، مگر ادبیاتِ عرب کا مشہور و معروف شعر ہے

قوم اذا الشر ابدیٰ ناجذیہ لھم   طاروا الیہ زرافات ووحدانا

(یہ وہ لوگ ہیں کہ جہاں خطرے نے اُنھیں اپنے دانت دکھائے کہ اُس کی جانب دو دو ایک ایک کرکے اُڑ چلے)

(ج) موت کے ناخن بھی تو نہیں ہوتے، مگر ابو ذویب ہذلی کہتا ہے:۔

واذا المنیۃ انشبت اظفارھا   الفیت کل تمیمۃ لا تنفع

(موت نے جہاں اپنے ناخن مارے کہ پھر تم کسی ٹونے ٹوٹکے کو سودمند نہ پاؤگے)

(د) نرمی و نرم دلی (ذلت) کے بھی تو پر نہیں ہوتے جسے نیچے لاسکیں یا اوپر اُٹھا سکیں، مگر اس آیت میں ہے :۔

واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ (۱۷-ع ۲) باپ ماں کے لئے مہربانی کے ساتھ نرمی و ملایمت کے پر نیچے کرو یعنی بچھا دو۔

(ہ) قرآن کے ہاتھ بھی تو نہیں ہیں، مگر قرآن خود کہہ رہا ہے :۔

مصدقا لما بین یدیہ قرآن کے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں جو چیز ہے۔ یعنی تورات و انجیل جو اُس کے روبرو ہے، وہ اُس کی تصدیق کر رہا ہے۔

(و) کفر بھی تو ہاتھ نہیں رکھتا، مگر اُس کے تذکرے میں ہے :۔

ذلک بما قدمت یداک یہ کیفیت تیرے دونوں ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔

(ز) عذاب بھی تو کوئی مجسم ہیکل نہیں ہے کہ اُسکے ہاتھ پاؤں ہوں، مگر قرآن کا بیان ہے :۔

انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید۔ سخت عذاب کے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں پڑنے سے میں تم کو ڈراتا ہوں۔

(ح) ملکیت رکھنے والوں میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جن کے داہنے ہاتھ کٹے ہوں یا سرے سے بنے ہی نہ ہوں، خدا یہ سب کچھ جانتا ہے اور پھر بھی کہتا ہے

او ما ملکت ایمانکم یا وہ جن کے مالک تمھارے داہنے ہاتھ ہوئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اُردو زبان کے ایک شاعر کے لئے جب یہ ادبی معذرت قابل پذیرائی ہے کہ :۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفت و گو بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام چلتا نہیں ہے دشنۂ و خنجر کہے بغیر

تو اہلِ نظر کی اس تحقیق پر کیوں نہ لحاظ کیا جائے کہ :۔

الغرض من هذا انہ قد یعبر بالجوارح عن معان لا یصح ان یکون خارجۃ [1]	غرض یہ ہے کہ تعبیر کلام میں اعضائے جوارح کا تذکرہ کرتے ہیں اور اُس سے وہ معانی مراد لیتے ہیں جن کا اصل مفہوم سے الگ ہونا درست نہیں۔



قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ سورۂ نون والقلم کی مشہور آیت یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یستطیعون (وہ دن آنے والا ہے جبکہ ساق کھلیگی اور لوگوں کو سرافگندگی کی دعوت دی جائے گی، مگر اُس وقت اُن میں اتنی قدرت واستطاعت کہاں؟) کی تفسیر میں راویان اخبار و آثار نے کیا کچھ اختلافات کئے ہیں۔ چار مختلف فصول میں ان مباحث کا استقصا ہو چکا ہے کہ:۔

(۱) کشف ساق کے یہ معنی کہ قیامت میں فی الواقع خدا کی ساقیں کھلجائینگی صحیح نہیں، جن روایتوں سے اس مفہوم کو تقویت دی جاتی ہے علم اصول اُنکو خود قابل استناد نہیں سمجھتا۔

(۲) ادبیات عرب میں عام قاعدہ ہے کہ الفاظ کچھ اور ہوتے ہیں مگر محاورے میں اُن کے کچھ اور ہی معنی لئے جاتے ہیں، طریق تعبیر کی بیشتر حقیقتیں مجاز سے وابستہ ہیں جن کو لفظوں کے ساتھ کچھ ایسا زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔

(۳) ادبیات عرب میں کشف ساق کے معنی نہایت سخت خطرہ (امر شدید) نمودار ہونے کے ہیں۔

(۴) کشف ساق سے اگر خدا ہی کی ساق کا نمودار ہونا مراد ہو جب بھی اس کے معنی تجسم نہ ہونگے، کیونکہ قرآن کریم، نیز کلام جاہلیت جس میں قرآن اترا ہے

[1] کتاب الاشارہ - ص ۱۲۲

اورجواُس کے انداز بیان کی نظیر ہے، اس مدعا کی تائید سے خاموش ہیں، یایوں کہئے کہ اسلوب عربیت اس قسم کے الفاظ کو اپنے اصلی معانی پر محمول نہیں کرتا۔ یہ چاروں موضوع استیعاب ذکرو استیفائے نظر کی حد میں آچکے ہیں لیکن مسئلے کی اہمیت کا ہنوز یہی اقتضا ہے کہ کچھ اورچاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے۔ تکمیل بیان کے لئے بقیہ مباحث قابل ملاحظہ ہیں :۔

(۵)

قرآن کریم میں لفظ ساق تین مقام پر وارد ہے :۔

(الف) سورہ نون والقلم میں جسپر بحث ہو چکی اور ہنوز ہوگی۔

وجوہ یومئذ ناضرۃ، الی ربھا	اُس دن بہتوں کے مُنہ تروتازہ ہونگے، جو اپنے
ناظرۃ، ووجوہ یومئذ باسرۃ	پروردگارکو دیکھ رہے ہوں گے، اوربہتیرے مُنہ
تظن ان یفعل بھا فاقرۃ، کلا	اُس روز بُرے بن رہے ہوں گے، اُن کو گمان
اذا بلغت التراقی، وقیل من راق	ہوگا کہ ایسی سختی اُن کے ساتھ ہونے والی ہے کہ
وظن انہ الفراق، والتفت الساق	اُن کی کمر توڑ دے گی، خوب سمجھ لوکہ جب ہنسلی تک
بالساق الی ربک یومئذ المساق	جان آپہونچیگی، اور لوگ چلا اُٹھینگے کہ کوئی جھاڑنیوالا
(۷۵ - ۱۱ و ۱۲)	ہے؟ یقین ہوجائیگا کہ یہ مفارقت کا وقت ہے

اُس وقت پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائیگی۔ تو یاد رکھ کہ اُسی دن تجھے اپنے پروردگار کی طرف چلنا ہوگا۔

اس آیت میں التفت الساق بالساق (پنڈلی سے پنڈلی مل جائیگی) کی تفسیر کئی طریقوں پر کی گئی ہے، بیں حدیثیں اس مفہوم کی مروی ہیں کہ التفات ساق سے شدت امر مراد ہے۔ ان میں دو خاص حدیثیں یہ ہے :۔

قولہ :۔ والتفت الساق بالساق　　آیت کے یہ الفاظ کہ "پنڈلی سے پنڈلی ملجائیگی"

یقول :۔ اٰخر یوم من الدنیا واول　　اس میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ :۔ وہ دن دُنیا

يوم من الآخرة، فتلتقي الشدة بالشدة إلا من رحم الله.[1]

کا سب سے پچھلا اور آخرت کا پہلا روز ہوگا، اُس روز سختی سے سختی کھِڑ جائیگی۔ ہاں جس پر خدا رحم کرے وہ البتہ اس سے محفوظ ہوگا۔

يقول التفت الدنيا بالآخرة وذلك شأن الدنيا والآخرة، ألم تسمع أنه يقول:- إلى ربك يومئذ المساق؟[2]

اُس دنیا و آخرت میں تصادم ہوگا، اور دنیا و آخرت کا یہی حال بھی ہے، اس مطلب کی تائید کیا تم نے آیت کا یہ جزو نہیں سنا کہ "وہی روز ہوگا کہ تمھیں اپنے پروردگار کے حضور میں چلنا ہوگا"؟

التفافِ ساق کی دوسری تاویلیں بھی کی گئی ہیں، مگر ابن جریر کی نقادِ نظر میں یہ سب مجروح ہیں، لکھتے ہیں:-

أولى الأقوال في ذلك بالصحة عندي قول من قال: معنى ذلك والتفت ساق الدنيا بساق الآخرة وذلك شدة كرب الموت بشدة هول المطلع، والذي يدل على أن ذلك تأويله، قوله :- إلى ربك يومئذ المساق، والعرب تقول لكل أمر اشتد:- قد شمر عن ساقه وكشف عن ساقه... عنى بقوله التفت الساق بالساق:- التصقت إحدى

میرے نزدیک اس باب میں بہتر و صحیح قول اُن مفسرین کا ہے جو آیت کے معنی یہ بتلاتے ہیں کہ دنیا کی ساق آخرت کی ساق سے ملجائیگی، مطلب یہ ہے کہ موت کی شدت و کرب ہول مطلع کی شدت سے دوچار ہوگی، اس مفہوم کی دلیل خود اسی آیت کا پچھلا جزو ہے کہ "اُس دن تجھے اپنے پروردگار کی طرف چلنا ہوگا" خطرہ جب بڑھ جاتا ہے، اور بات سخت ہوجاتی ہے، تو اہل عرب کہتے ہیں "فلاں امر کی ساق سے دامن اُٹھ گیا" یا

[1] علي قال ثنا ابو صالح قال ثني معاوية عن علي عن ابن عباس قوله الخ۔

[2] محمد بن سعد قال ثني ابي قال ثني ابي عن ابيه عن ابن عباس الخ۔

الشدتین بالاخری کما یقال	اُس کی ساق کھل گئی"..... آیت میں ایک
للمرأة اذا التصقت احدیٰ	ساق کے دوسری ساق سے مل جانے کے معنی
فخذ یہ بالاخریٰ لفاء [۱]	یہ ہونگے کہ ایک سختی دوسری طرح کی شدت سے

پیوست ہوگئی، جس طرح کسی عورت کی ایک ران دوسری ران سے پیوستہ ہوگئی ہو تو اُسے لفار (باہم پیوستہ ہوجانے والی) کہتے ہیں۔

(ج) سورۂ نمل میں جہاں ملکۂ سبا کو خطاب کیا گیا ہے:۔

قیل لھا ادخلی الصرح فلما راتہ	ملکہ سبا سے کہا گیا کہ محل کے اندر آؤ، اُس نے
حسبتہ لجة وکشفت عن ساقیھا	محل کو دیکھا تو پانی سمجھی، اس خیال سے اپنی
قال انہ صرح ممرد من قواریر	دونوں پنڈلیاں اُس نے کھولدیں، سلیمان نے
(۲۷-۳۶)	یہ دیکھکر کہا کہ یہ تو شیش محل ہے۔

اس آیت میں کشف ساق کے معنی عام مفسرین نے پنڈلی کھولنے کے لئے ہیں، مگر امام رازی نے تبعاً دو تین باتیں اور بھی بیان کی ہیں، فرماتے ہیں:۔

(۱) انما فعل ذلك لیزیدھا	(۱) حضرت سلیمان نے شیش محل اسلیئے بنوایا تھا
استعظاماً لامرہ......	کہ ملکہ سبا کی نظر میں اُن کی عظمت بڑھ جائے۔
(۲) کان المقصود من الصرح	(۲) تعمیر محل سے مجلس کو خوفناک و باعظمت
تھویل المجلس وتعظیمہ....	دکھانا مقصود تھا۔
(۳) حسبت ان سلیمان علیہ	(۳) ملکۂ سبا سمجھی کہ حضرت سلیمان اُسکو پانی
السلام یغرقھا فی اللجة [۲]	میں غرق کیا چاہتے ہیں۔

یہ تاویلیں اگر صحیح ہیں تو ان کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حضرت سلیمان (علی نبینا

---

[۱] ابن جریر۔ ج ۲۹۔ ص ۱۰۷۔

[۲] تفسیر کبیر۔ ج ۵۔ ص ۸۹۔

و علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے ملکۂ سبا کو مرعوب کرنے اور اُسکے دل پر اپنی ہیبت وعظمت کا سکہ بٹھانے کے لئے شیش محل تعمیر کرایا ہوگا، ملکۂ سبا اُسے دیکھ کر پانی سمجھی اور خیال کیا کہ سلیمان نے بدعہدی کی، یہاں بُلاکر تو مجھے غرق کیا چاہتے ہیں، اس خیال کے آتے ہی ساق کھول دی، یعنی غیظ میں آگئی، گھبرا اُٹھی، ناراضی و ناخوشی بڑھ گئی، سخت ہوگئی، خطرہ پیدا ہوگیا، حضرت سلیمان نے یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا:۔ یہ پانی کا تموّج نہیں ہے، شیش محل کا سراب ہے، ملکہ یہ سُنکر پچھتائی، اپنی بدگمانی سے پشیمان ہوئی اور کہا:۔

رب انی ظلمت نفسی واسلمت مع سلیمان للہ رب العالمین (۲۷-۴۴)	میرے پروردگار! میں نے (یہ بدگمانی کرکے) اپنی جان پر ظلم کیا، اب میں سلیمان کے ساتھ ہوکر رب العالمین کے لئے مسلمان ہوتی ہوں۔

یہ مطلب اگر صحیح ہے تو حضرت سلیمان پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہوسکتا کہ اُنھوں نے کیوں ایسی ترکیب کی کہ ایک پرائی عورت اپنی پنڈلیاں کھول دے اور وہ اُسے دیکھیں؟ جب ایراد ہی رفع ہوگیا تو جواب دینے کے لئے کسی تاویل کی کیا حاجت؟

(۶)

گذشتہ مباحث سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

(الف) قرآن کریم نے پنڈلی کے معنی میں ساق کا لفظ کہیں بھی استعمال نہیں کیا ہے۔

(ب) قرآن کریم میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے قطعی ثبوت مل سکے کہ یوم یکشف عن ساق (وہ دن جب ساق کھلیگی) سے خدا کی ساق کا کھلنا مراد ہے۔

یہی بخاری کی مشہور حدیث:۔

سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: یکشف ربنا عن ساقه فیسجد له کل مؤمن ومؤمنة، ویبقی من کان یسجد فی الدنیا ریاء وسمعة فیذهب لیسجد فیعود ظهره طبقا واحدا[1]

ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سُنا کہ ہمارا پروردگار اپنی ساق کھولدیگا، جتنے مسلمان مرد عورتیں ہونگی سب کی سب سجدے میں گر پڑینگی، صرف وہ لوگ رہ جائینگے جو دنیا میں دکھانے اور سُنانے کے لئے سجدے کیا کرتے تھے، وہ اُس وقت سجدہ کرنے چلینگے تو اُن کی پیٹھ ایک تختہ ہو جائے گی۔

تو قطع نظر دیگر مباحث کے جو توجیہ وتفسیر قرآن کریم کی آیات کی کیجاتی ہے، ضرور ہے کہ وہی اس حدیث کی بھی کی جائے۔ نظام نیشاپوری کی اُس لطیف توجیہ کو بھی پیش نظر رکھئے جس میں وہ لکھتے ہیں:۔

معناه یوم یشتد الامر ویتفاقم، ولا کشف ثمة ولا ساق، کما تقول للاقطع الشحیح: یده مغلولة ولا ید ثمة ولا غل، وانما هو مثل فی البخل ...... وقال ابوسعید الضریر: ساق الشیئ اصله الذی به قوامه، کساق الشجر وساق

آیت کے معنی یہ ہیں کہ اُس دن صورت معاملہ نہایت سخت وشدید و دشوار ہو جائے گی، ورنہ اصل میں تو وہاں ساق کھلنے کا شائبہ ہے اور نہ ساق ہی ہے کہ کھلی یا ڈھنکی رکھی جائے۔ مثلاً ایک بخیل کے ہاتھ کٹے ہوئے ہیں تم اُسے کہوگے کہ "اسکے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں"، حال آنکہ نہ وہاں ہاتھ ہیں اور نہ بندش ہے بلکہ در اصل یہ ایک مثل ہے جس سے اظہار بخل منظور

[1] اخرجه البخاری عن ابی سعید قال سمعت الخ وهذا الحدیث عندهم من طرق فی الصحیحین وله الفاظ فی بعضها طول، وهو حدیث مشهور معروف، وعلی کل ذلک فهو لا یحتج بتجسیم تعالی شانه عما یقولون، ولله فی خلقه شئون، والله یعلم وانتم لا تعلمون۔

الانسان، فمعنی الآیة يوم تظهر حقائق الاشياء واصولها [1]

ہوتا ہے....... ابوسعید ضریر کہتے ہیں:۔ ساق شے وہ ہے جس سے کسی چیز کا قوام وابستہ ہو، جیسے ساق درخت، ساق انسان، اس بنا پر آیت کے معنی یہ ہونگے کہ اُس دن اشیاء کی حقیقتیں اور اصلیتیں ظاہر ہوں گی۔

(۷)

یہ جو کچھ پیش آتا ہے دنیا ہی میں پیش آئیگا، قیامت سے ان واقعات کو تعلق نہیں ہے، قیامت تو وہ دن ہے کہ کسی کو کسی بات کی تکلیف نہ دیجائیگی۔

نہ رکوع ہے، نہ سجود ہے، نہ قعود ہے، نہ قیام ہے،

لیکن یہاں ارشاد ہوتا ہے :۔

يوم يكشف عن ساق ويدعون الى السجود فلا يستطيعون ۔

وہ دن جب خطرہ بڑھ جائیگا، لوگ سجدہ و اطاعت و سرافگندگی کیلئے بلائے جائینگے مگر نہ کر سکینگے۔

پھر کیونکر ممکن ہے کہ قیامت کے دن، جو احتساب اعمال کا روز ہے، عبادت کا حکم دیا جائے، ابومسلم اصبہانی لکھتے ہیں :۔

لاريب ان يوم القيامة ليس فيه تعبد وتكليف فهو زمان العجز اذ اخر ايام دنياه فانه فی وقت النزع تری الناس يدعون الی الصلاة بالجماعة وهؤلاء لا يستطيعون الصلاة ، لانه الوقت الذی لا ينفع نفسا ايمانها

بے شبہ قیامت کا دن عبادت کرنے کا دن نہوگا، اُس دن کسی بات کے ماننے یا کسی کام کے کرنے پر کوئی مکلف نہوگا، وہ عاجزی و ضعف کا وقت یا دنیا کا سب سے پچھلا اور نچلا حصہ ایام ہوگا، دیکھو نزع روح کے وقت بھی نمازیوں کو نماز کے لئے پکارتے ہیں، جماعت کے لئے اذان دیتے ہیں، حی علی الصلوٰۃ کی منادی سے اُن کو مسجد میں بلاتے ہیں، مگر وہ نماز نہیں ادا کر سکتے

[1] نیسا بوری ۔ ج ۲۹ ۔ ص ۲۳۔

وہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ ایسے وقت میں کسی شخص کے لئے خدا پر ایمان لانا بھی نفع نہیں دیسکتا۔

(۸)

بہ پایاں آمد این دفتر حکایت ہمچناں باقی، کہنا یہ تھا کہ کشف ساق کے ذیل میں قرآن کریم نے کن امور کی تعلیم دی ہے؟ اور اُن کے خاص خاص نتائج کیا ہیں؟ اصل میں تو یہ "سودا" خواجہ شیراز کے مخاطب کے اُس "خط سبز" سے بھی زیادہ طراوت افزائے نگاہ ہے جس کی نسبت نقطۂ نظر نے "پائے ازیں دائرہ بیروں نہ نہد تا باشد" کا فتوی دیا تھا، تاہم سلسلۂ حقایق دراز سہی، اس حلقے کی کڑیاں کیونکر ڈھیلی ہوسکتی ہیں کہ تقیدات الٰہیہ کی بندش میں ڈھیل دی جاسکے حقیقت کو "لقد وجدت مجال القول ذا سعة" کا جب خود اعتراف ہے تو "فان وجدت لسانًا قائلاً فقل" کی معذرت کوش تعلیق کے کیا معنی؟ زبان گویا کا کام شرح صدر سے لے سکتے ہیں، الہامی تعلیمات کے بعض بعض خصائص ہی کے تذکرے سے رفع ذکر ممکن ہے، ملاحظہ ہوں:۔

کشف ساق کے مافوق و مابعد آیتوں میں، جن مہمات امور کی تعلیم دی گئی ہے، اُن کے خاص خاص پہلو یہ ہیں:۔

(۱) مسلمانوں کے مذہبی جوش کو کفار کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتے، وہ اُن کو خبطی کہینگے، مفتون کہینگے، گمراہ کہینگے، شوریدہ سر کہینگے، مگر کہنے دو، اس پاک ترین جذبۂ غیرت سے ہٹنا نہ چاہیئے، اس حالت پر قائم رہنا چاہیئے، تم بھی دیکھ لوگے اور وہ بھی دیکھ لینگے کہ خبط کس کو ہے؟ وہ زمانہ عنقریب آنے والا ہے، جبکہ اپنے خبط و شوریدگی کا انھیں خود اعتراف کرنا پڑیگا، مسلمان اُنکے الزامات کے خوف سے مرعوب کیوں ہوں؟ اس کا علم تو خدا ہی کو ہے کہ راہ راست پر کون ہے، اور گمراہی نے کسے گھیر رکھا ہے؟

(۲) کفار جو واقعات کو جھٹلاتے ہیں، حقیقت حال کو جھٹلاتے ہیں، اصلیت کو چھپاتے ہیں، ماجرائے وقوع کو غلط بتاتے ہیں، نقض امن کرتے ہیں اور پھر اُس کو حفظ امن کا لباس پہناتے ہیں، قتل کرتے ہیں اور اُسے جاں بخشی دکھاتے ہیں، بات کچھ ہوتی ہے مگر اپنی بات کی ترج میں جمہور (پبلک) کو کچھ اور جتاتے ہیں، ایسے لوگوں کی اطاعت منع ہے، اُن کی فرمانبرداری جرم ہے، گناہ ہے، موجب عذاب ہے، اس قلادے کو توڑ دینا چاہئے، اس اطاعت سے تبری فرض ہے، اس فرمانبرداری پر نافرمانی کو ترجیح ہے، اُن کی تو خواہش ہے کہ مسلمان مداہنت کریں، خوشامد کریں، ریاکاری کریں، منافقت کریں، تو انھیں بھی اظہار نفاق کا موقع ملے، مگر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ صورت کس قدر خطرناک ہے۔

(۳) کفار کے عہد و پیمان کا تمھیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے، وہ آبرو باختہ ہیں عزت نفس و شرف ذات کا انھیں لحاظ تک نہیں، قسمیں کھاتے ہیں، حلف اُٹھاتے ہیں، کہ یہ وعدہ استوار ہے، اس میں دوام و استمرار ہے، یہ عہد محکم ہے، یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے، زبان سے سب کچھ کہتے ہیں، اور ہاتھ سے کام لینے کے وقت کچھ بھی یاد نہیں رکھتے، ایسے لوگوں کے مطیع رہنا ذلت کی بات ہے، اسلام اپنے فرزندوں کو ان کی اطاعت سے باز رہنے کی ہدایت کر رہا ہے، روکتا ہے، منع کرتا ہے، کہ خبردار! یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں، ان کے حلف پر نہ جانا، یہ اِدھر کی بات اُدھر لگاتے ہیں، قوم میں تفرقے پیدا کرتے ہیں۔ منع خیر کے لئے نہایت مبالغے کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں، حد سے بڑھ جاتے ہیں، تعدی ان کا شیوہ ہے، قطاول ان کی عادت ہے، سرکشی ان کی خو ہے، پاس عزت نہ رکھنے، ناموس کی نگہداشت ضروری نہ سمجھنے، اور خاص خاص حالتوں میں رضامندی کے ساتھ حرام کاری تک کو قانوناً جائز قرار دینے

کی وجہ سے ان کی تو اصل تک محفوظ نہیں، یہ تو صریح بد اصل ہیں، پھر ایسے لوگوں کی اطاعت کیونکر پسندیدہ ہو سکتی ہے؟ اُن کو تو اپنے مال و اولاد کی فراوانی و کثرت یعنی فرطِ دولت و تکثیر آبادی کی وجہ سے اتنا گھمنڈ ہو گیا ہے کہ آیات قرآنی کو پُرانے ڈھکوسلے کہنے لگے ہیں، مصر کی ایک برگشتہ خرد و بیدا فروختہ مزاج مسلمان لیڈی (پرنسس صالحہ) یورپ میں جاکر ایک روسی افسر سے شادی کر لیتی ہے، اور اُسے مختار عام قرار دیکر اپنی جائداد کے لئے دعویٰ دائر کراتی ہے، مصر کی شرعی عدالت پچھلے مہینے میں اس دعوے کو خارج کر دیتی ہے کہ مسلمان عورت نے احکام اسلام کی قید سے آزاد ہو کر جب ایک نامسلمان سے شادی کر لی تو پھر مسلمان کہاں رہی، اور اب اُس کو جائداد کے مطالبہ کا کیا حق رہ گیا ہے؟ صحافت فرنگ اس فیصلے پر سختی سے نکتہ چینی کرتی ہے اور عام جرائد و مجلات یورپ کی گذشتہ اشاعتوں میں فریاد ہوتی ہے کہ "اس آئین و اصول کے عہد میں اسلام کے احکام پر کیوں عمل ہوتا ہے؟ یہ احکام تو صریحاً پُرانے ڈھکوسلے (اساطیر الاوّلین) ہیں"، جب اس بے باک جماعت کو جناب الٰہی میں بھی گستاخی سے باک نہیں، تو حیف ہے کہ بندگان الٰہی ایسے سرکشوں کے مطیع رہیں، ان کی اطاعت سے فوراً کنارہ کش ہو جانا چاہئے، یہ خوف بالکل بے محل ہے کہ مبادا نافرمانی کی صورت میں کیسی پڑے؟ کیونکہ خدا ان سرکشوں پر عنقریب عذاب نازل کرنے والا ہے سنسمہ علی الخرطوم کی وعید آچکی ہے، اور اب اس کے پورے ہونے میں بہت کم دیر رہ گئی ہے۔

(۴) ارادہ تو کفار کا یہی ہے کہ باغ عالم (ممالک روئے زمین) انھیں کے لئے مخصوص ہو جائے اور اُس کے ثمرات سے اُن کے علاوہ کوئی دوسری غریب قوم مستفید نہ ہونے پائے، مگر ہنوز وہ خواب غفلت ہی میں رہینگے کہ ذرائع

شان وشوکت میں تباہی آجائے گی، عظمت ورفعت کا سارا سازوسامان خاک میں مل جائیگا، چلے تو ہیں کہ دنیا کو فتح کریں اور اقوام دنیا کو غلام بنالیں، مگر بجز محرومی قسمت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا، اس وقت تو خدا کو بھولے ہوئے ہیں، لیکن انجام کار جب تباہی نازل ہوگی تو وہی خدا یاد آئیگا جس کی اور جس کے گھر کی تذلیل وتخریب میں وہ اس وقت سرگرم ہیں، وہ ایسا نازک وقت ہوگا کہ ان ظالموں کو بھی اپنے جور وستم کا اعتراف کرنا پڑیگا، اپنی سرکشی پر پچھتا ئینگے، ایک دوسرے کو الزام دینگے کہ ظلم نہ کئے ہوتے تو ملک ودولت سے کیوں محروم ہوتے، اس محرومی کے عالم میں یہ امید ڈھارس بندھا ئیگی کہ ایک ملک گیا تو گیا، شاید اس سے بہتر کوئی دوسرا ملک قبضے میں آجائے لیکن یہ وہ عذاب نہیں کہ اس سے نجات ممکن ہو، اور کچھ اسی پر موقوف نہیں، اس کے بعد جو آخری عذاب آئیگا وہ اس سے بھی خوفناک ہوگا۔

(۵) مسلمان کفار کے مقابلے میں ضرور کامیاب ہونگے، مگر کامیابی کے لئے شرط یہ ہے کہ تقویٰ (شریفانہ کیریکٹر) سے موصوف ہوں، چاہنے کو تو کفار اب بھی چاہتے ہیں کہ مسلمان مجرم ثابت ہوں اور اُن کے ساتھ مجرمانہ برتاؤ کیا جائے، اس غرض کی تکمیل کے لئے انتہائی کوشش کریں گے اور سب کچھ کر دیکھیں گے، مگر خدا ایسی ناپاک ونجس تدبیروں کو کامیاب نہونے دے گا۔

(۶) خطرہ ہر سمت سے بڑھ چلا ہے اور اب اس کے منتہائے اشتداد کا وقت آیا ہی چاہتا ہے، ظالموں کو اسلام کے روبرو اظہار تذلل واطاعت کی دعوت دی جائے گی، مگر وہ کچھ ایسے بدحواس ہونگے کہ یہ بھی نہ کر سکینگے، جی بھر کے آج اسلام کی توہین کر لیں مگر کل ہی سے ان کا تدریجی زوال اس طرح

شروع ہو گا کہ بالفعل تو اُن کو ڈھیل دی جارہی ہے، لیکن آخر انھیں خبر بھی ہوگی اور ان کی ہستی فنا ہو جائے گی، خدا کی تدبیر بڑی پختہ و محکم ہے، وہ یہ داؤ کھیل کے رہیگا۔

(۷) کفار سے مسلمانوں کو کسی انعام کا طلبگار ہونا چاہئے، کسی احسان کا آرزو مند نہ رہنا چاہئے، مسلمانوں کی کوئی چیز اُن کے قبضہ میں جاتی رہے تو اسکا معاوضہ ملنے کی امید نہ رکھنی چاہئے، جہاں کوئی امید نہیں، توقع نہیں، مطالبہ نہیں، وہاں تو کفار سرگرداں ہی رہتے ہیں، جہاں ان چیزوں کا قدم آئیگا وہاں کیا ہونا ہے! ؟ مسلمان اگر کامیابی کے آرزو مند ہیں تو حصول کامیابی کے وقت تک نہایت مستقل مزاج و ثابت قدم رہنا چاہئے، حضرت یونس پیغمبر تھے، بایں ہمہ استقلال میں کچھ فرق آنا تھا کہ مصیبت میں پھنس گئے، خدا کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو نجات ہی ممکن نہ تھی، اسی طرح مسلمان اگر مستقل مزاج نہ رہے تو ابتلا سے مفر نہیں، اور اگر صبر و ثبات و استقلال پر متمسک رہے تو یاد رکھو، ثبت قدم ہر ایک بلا سے محفوظ رہیگا، اور انجام کار فاجتباہ وھو من الصالحین کا وہی مصداق ٹھہرے گا، واللہ ولی التوفیق۔



قتلِ نفس

حقوق و فرائض عباد میں سے سب سے اول و افضل فرض یہ ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کی زندگی کی حرمت اور اُس کی جان کی عزت کرے، جب تک حرمت زندگی و عزتِ جان نہیں، اُس وقت تک دُنیا میں راحت و اطمینان بھی نہیں۔

قابیل و ہابیل

کتب الٰہیہ نے بتایا ہے کہ اس بدترین فعل شیطانی کا مبتدعِ اول وہ گنہگار انسان (قابیل) تھا، جسکے سوء نیت اور خباثتِ قلب کو دیکھکر خدا نے قربانگاہ میں اُس کی قربانی قبول نہ کی، لیکن اُس کے بھائی (ہابیل) کی قربانی قبول ہوئی کہ وہ نیت کا خالص اور دل کا نیک تھا۔ یہیں سے قربانی کی حقیقت بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ جانور کی گردن سے خون گرانے کا نام نہیں، بلکہ نیکی اور پاکی کے چند قطرات خونیں سے عبارت ہے، جو خدا کے نام پر دل سے کہ مستقر خیالات ہے، ٹپکیں۔

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا — خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہونچتا، بلکہ صرف

لکن ینالہ التقویٰ منکم (۲۲-۳۸) — تمھاری نیکی ہی خدا تک پہونچتی ہے۔

(قابیل) نے دیکھا کہ خدا نے اُسکے بھائی (ہابیل) کی قربانی کو قبول کی عزت بخشی لیکن اُس کی قربانی کو عزت نہ دی، وہ رنجیدہ ہوا، اور اپنے بھائی کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین کیا۔ (توراۃ - پیدائش ۴-۴)

قرآن مجید نے اسی قصہ کو ان الفاظ میں دُہرایا ہے:-

واتل علیھم نبأ ابنی ادم بالحق — اے پیغمبر! ان لوگوں کو آدم کے دو بیٹوں کا سچا

اذ قربا قرباناً فتقبل من احدھما
ولم یتقبل من الاخر، قال لاقتلنک
قال انما یتقبل اللہ من المتقین،
لئن بسطت الی یدک لتقتلنی ما انا
بباسط یدی الیک لاقتلک، انی
اخاف اللہ رب العالمین، انی ارید
ان تبوء باثمی واثمک فتکون من اصحٰب
النار، وذٰلک جزاء الظالمین، فطوعت
لہ نفسہ قتل اخیہ فقتلہ فاصبح
من الخاسرین (۵-۳۳)

قصہ سُناتا ہے۔ جب دونوں نے خدا کے حضور اپنی اپنی قربانیاں پیش کیں تو ایک کی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی جسکی قبول نہوئی اُس نے اپنے بھائی سے کہا کہ میں تجھکو قتل کرونگا بھائی نے کہا۔ قربانی خدا نیکوں کی قبول کرتا ہے اور تم اگر میرے قتل کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہو تو بڑھاؤ۔ لیکن میں تو نہیں بڑھاتا۔ میں اپنے خدا سے ڈرتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا، دونوں کا گناہ تم ہی اٹھاؤ اور دوزخ کے سزاوار بنو کہ ظالموں کی یہی جزا ہے۔ پہلا بھائی اپنے نفس کا مطیع بن کر اپنے بھائی کا قاتل ہوا۔ اور مبتلائے خسران!

یہ پہلی خونریزی تھی جو دنیا میں ہوئی، اور خونِ بے گناہی کا پہلا قطرہ تھا جو زمین پر گرا۔ دنیا میں جب کبھی اس کی مثال ظاہر ہوگی، تو آدم کا قاتل فرزند ہی اُس کا ذمہ دار ہوگا کہ اس شرارت کا تخم زمین میں سب سے پہلے اُسی نے بویا۔

حدیث صحیح ہے:-

لا تقتل نفس الا کان لابن آدم
الاوّل کفل منہا (بخاری)

دنیا میں جب کوئی مظلوم قتل کیا جاتا ہے تو آدم کے فرزند اوّل کو بھی اُس میں سے حصہ ملتا ہے۔

نیکی اور بدی کا بیج

اسی طرح ہر نیکی کا مبتدع اور فاعلِ اوّل، جب تک وہ نیکی دنیا میں باقی ہے اُسکے ثواب عمل سے بہرہ ور ہوگا، کیونکہ سب سے پہلے اُسی نے دُنیا کو یہ نیکی سکھائی۔

یہی مطلب ہے اس حدیث مشہور کا :۔

من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا	جو کوئی نیک طریقہ جاری کرے گا، اُس کو بھی اُس
واجر من عمل بھا (ص ح)	نیکی کرنے والے کی طرح ہمیشہ ثواب ملے گا۔

پس جو وجود دنیا میں کوئی بدی لایا، وہ تمام دُنیا کا دشمن ہے کہ وہ بدی ہر ایک کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ اور جو دُنیا کو کوئی نیکی سکھاتا ہے، وہ تمام دنیا کا محسن ہے، کیونکہ اُس سے دُنیا کی ہر زندگی متمتع ہو گی۔ اسی لئے خدائے پاک نے آدم کے ان دونوں بیٹوں کے قصے کے بعد فرمایا :۔

من اجل ذٰلک کتبنا علی بنی اسرآئیل	اسی لئے ہم نے بنی اسرائیل کو کہدیا کہ جو کسی
انہ من قتل نفسا بغیر نفس او فساد	کو بغیر اسکے کہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہو یا
فی الارض، فکانما قتل الناس جمیعًا	زمین میں اُس نے کوئی فتنہ برپا کیا ہو، قتل
ومن احیاھا فکانما احیا الناس	کرتا ہے وہ گویا تمام بنی نوعِ انسانی کو قتل
جمیعا (۵ - ۳۵)	کرتا ہے، اور جو کسی کو اپنی مہربانی سے زندہ کرتا

ہے، وہ گویا تمام نوعِ انسان کو زندہ کرتا ہے۔

حفظ نفس

اس معجزانہ، پُر اثر، اور مخفی طرزِ ادا کے علاوہ خدا نے کئی بار اعلانیہ خوں ریزی کو منع فرمایا۔ سورۂ انعام میں ہے :۔

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللّٰہ	جان جس کا قتل خدا نے حرام کیا، حق کے سوا،
الا بالحق، ذٰلکم وصاکم بہ لعلکم	کسی اور سبب سے اُس کو ہلاک نہ کرو، خدا تمھارے
تعقلون۔ (۶ - ۱۵۸)	سمجھنے کے لئے تم کو یہ نصیحت کرتا ہے۔

اور پھر سورۂ بنی اسرائیل میں فرماتا ہے :۔

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق، ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیہ سلطاناً، فلا یسرف فی القتل انہ کان منصوراً۔ (۱۷-۳۵)

جان جس کا قتل خدا نے حرام کیا، حق کے سوا کسی اور سبب سے اسکو ہلاک نہ کرو، جو مظلوم ہو کر مارا جائے، اسکے وارث کو ہم نے قصاص اور بدلے کا اختیار دیا ہے مگر وہ اس انتقام میں تعدی اور زیادتی کسی طرح نہ کرے۔ اس طرح یقیناً وہ مظفر و منصور ہوگا۔

یہ حکم امن عالم اور حفظ انسانیت سے متعلق ہے، اسی لئے جب کسی دور و عصر میں امن عالم کا محافظ ربانی اور حفظِ انسانیت کا واعظ روحانی دنیا میں آیا، تو اُسنے اس حکم کا اعادہ کیا۔

تم نے اُس فرمان کو سنا ہے، جو امن عالم کے ایک "محافظ اکبر" نے مقدس جماعتِ انسانی کے روبرو اور "بیتِ خلیل" کے سامنے دنیا کو سنایا تھا؟

الا ان دماءکم واموالکم محرمۃ علیکم، کحرمۃ یومکم ھذا، فی بلدکم ھذا، فی شہرکم ھذا!

آگاہ ہو کہ تمھارا خون، تمھارا مال، ایک دوسرے کے لئے محترم ہے، جس طرح آج روز حج اس شہر مکہ میں اس ماہ ذیحجہ میں محترم ہے۔

اسی طرح وہ جو "کوہ طور" سے آیا، اور اُس نے بھی جو "کوہِ زیتون" پر نمودار ہوا، یہی کہا تھا کہ "تو خون مت کر"

حفظِ نفس کے لئے قتل نفس

لیکن جس طرح قیامِ امن و احترام روح انسانیت کے لئے سفکِ دم و قتلِ نفس ممنوع ہے، اسی طرح کبھی کبھی انھیں عزیز ترین متاعِ عالم کی حفاظت و عزت کیلئے سفکِ دم و قتلِ نفس ضروری بھی ہوجاتا ہے۔ ایک جماعت انسانی کا مجرم، ایک نفس زکیہ کا قاتل، ایک حکومتِ صالحہ کا باغی، اور ایک برہم زنِ امن عالم کا قتل،

عین عدل ونفس انصاف ہے، تاکہ دنیا کی صلاح وسلام واپس آئے، اور انسانیت وروح کی عزت واحترام باقی رہے۔

عفو وانتقام

اسلام سے پہلے دنیا نے صرف دو اصولوں پر کام کیا ہے، عفو اور انتقام۔ ہم نے موسیٰؑ کی شریعت میں "جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت"، پڑھا ہے، لیکن یہ نہیں پڑھا کہ "اے اسرائیل! برے بندوں کو معاف کر دے"

ہم نے مسیحؑ کو سنا کہ اس نے (گلیل) کی سرزمین میں ایک پہاڑ کے نیچے کہا:۔

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا، آنکھ کے بدلے آنکھ، اور دانت کے بدلے دانت، پر میں تم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اسکی طرف پھیر دے، جو تیرا کرتہ لے اس کو چوغہ بھی لے لینے دے جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اسکے ساتھ دو کوس چلا جا" [1]

ہم نے یہ سنا، لیکن یہ تو نہیں سنا کہ اس نے کہا ہو:۔ "شریروں اور بدکاروں کو ان کے اعمال کی سزا دو کہ آسمان کی بادشاہت کی طرح زمین کی بادشاہت میں بھی امن وسلامتی ہو"

لیکن ہم نے مسیح کے بعد (بطحاء) کی سرزمین میں، جبل حراء کے دامن میں، ایک اور بولنے والے کا کلام سنا، جس نے گلیل کے منادی کی طرح پہلے کہا:۔

ادفع بالتی ھی احسن السیئۃ (۲۳-۹۷) برائی کا معاوضہ ہمیشہ نیکی سے دو۔

ویدرءون بالحسنۃ السیئۃ اولئک آنے والے گھر کا انجام ان کے لئے ہے جو برائی

[1] توراۃ۔ سفر خروج ۔۲۵-۲-۲۔ اور متی ۵-۳۸۔ (منہ)

لھم عقبی الدار۔ (۱۳۔۲۴) کو نیکی سے دفع کرتے ہیں۔

لیکن ساتھ ہی اُس نے سلطانِ عدل کے جلال، امنیت عالم کے احترام، نظامِ مدنیت کے قوام، اور قانون و عدالت کی ہیبت کے ساتھ کہا، جیسا کہ موسیٰؑ نے بادل کی گرج، بجلی کی چمک، اور قرنا کی آواز میں سنا تھا:۔

فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ مع المتقین (۲۔۱۹۴) — جو تم پر تعدی کرے تم بھی اسی طرح اور اسی قدر اُس پر تعدی کرو، خدا سے ڈرو اور یقین کرو کہ خدا اپنے سے ڈرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

پھر اُس نے موسیٰؑ کے قانون کا اعادہ کیا:۔

وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس والعین بالعین والانف بالانف والاذن بالاذن والسن بالسن والجروح قصاص (۵۔۴۸) — ہم نے تورات میں لکھدیا ہے کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان دانت کے بدلے دانت اور زخم کے بدلے زخم ہے۔

وہ ادھوری باتوں کو جیسا کہ (مسیح) نے کہا تھا، پورا کرنے کے لئے آیا تھا۔ وہ آیا اور اُن کو پورا کیا۔ اُس نے کہا کہ "تم دشمنوں سے درگذر کرو، اور برائی کو نیکی کے ذریعہ دور کرو"۔ اُس نے صرف یہی نہیں کہا کہ دشمنوں کے شدائد جبر کے ساتھ تحمل کرو بلکہ یہ بھی کہا کہ تحمل کرو اور احسان کرو برائی کو انگیز کرو اور اُس کی جزا نیکی کے ساتھ دو کہ یہ حصولِ امن کا ذریعہ اور کسب صلح و سلام کی تدبیر ہے۔

ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن السیئۃ، فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔ وما یلقاھا الا الذین صبروا، وما یلقاھا — "نیکی اور بدی برابر نہیں۔ نیکی سے بدی کو دور کرو کہ اس سلوک سے وہ، جسکو تم سے عداوت ہے، تمھارا دوست ہو جائیگا۔ یہ وہ طریقۂ اخلاق ہے جس پر صرف صابر

الا ذو حظٍ عظیم (۳۴-۴۱) اور خوش قسمت انسان ہی عمل کرتے ہیں۔

قانون حفظ و قتل

لیکن یہ عفو و حلم، یہ صفح و درگذر، یہ تحمل و انگیز، کب تک؟ اُس وقت تک جب تک کہ اُس شر اور بدی کا اثر شخص واحد تک محدود ہو، اور صرف ایک ذات خاص ہی کے منافع خصوصیہ میں محصور رہو کہ یہ جرم ایک شخص واحد اور ذات خاص کا ہے، جس کے معاملات و حوادث خصوصیہ کو ہیئت اجتماعیہ اور سوسائٹی سے تعلق نہیں۔

وہ پانی کا ایک بلبلہ ہے جو ایک ٹھوکر سے پیدا ہوا اور مٹ گیا۔ اس جرم کو معاف کرو کہ اشخاص کی ذاتی محبت و مودّت اور شخصی لطف و رحم کو ترقی ہو، اور دنیا امن و صلح سے بھر جائے۔ یہی وہ موقع ہے جہاں (مسیح) کے حکم پر عمل کرنا عین اسلام کی تعلیم ہے۔

لیکن دنیا میں ایسی بھی بدیاں ہیں جو گو ایک شخص خاص کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں، لیکن وہ سمندر کی لہریں ہیں، جو ہوا کے جھونکوں سے پیدا ہوتی ہیں اور دور تک پانی کی سطح کو متزلزل کر دیتی ہیں۔ وہ گو ایک ذاتِ واحد کا گناہ ہے لیکن اپنی وسعت اثر و قوتِ نفوذ کے لحاظ سے تمام مجتمع انسانی کا گناہ ہے، پھر جب وہ تمام مجتمع انسانی کا گناہ ہے تو ایک شخص خاص کو کیا حق ہے کہ وہ اس گناہ کو معاف کرے، اور اگر کرتا ہے تو وہ خود تمام مجتمع انسانی کا گناہ کر رہا ہے۔

زید، خالد کے گھر میں سرقہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اب خالد کو کوئی حق نہیں کہ وہ زید کے گناہ کو معاف کرے، اور اگر کرتا ہے تو گویا اُس کو اعادۂ جرائم و معاصی کی تعلیم دیتا ہے۔

عمر، بکر کے قتل کا مرتکب ہوتا ہے، بکر کا باپ اب حق نہیں رکھتا کہ اُس کے اس جرم کو معاف کرے۔ اگر وہ معاف کرتا ہے تو اُسکا عفو جرأت آموز جرائم قتل ہے، اس لیئے اب عمر، صرف بکر کے موالی واعزہ ہی کا گنہگار نہیں بلکہ خود مجتمع انسانی کا، امن وعدل عالم کا، اور حکومت کا گنہگار ہے۔ اسی نکتہ کی طرف کتاب حکیم نے منافع وقصاص پر بحث کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے :-

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا۔ (۵-۳۶)	جس نے کسی کو بغیر اسکے کہ وہ مرتکب قتل ہوا ہو یا اُس نے زمین میں فساد برپا کیا ہو، قتل کردیا تو اُس نے گویا تمام دُنیا کو قتل کر دیا اور جس نے ایک کو زندہ بچایا تو اُس نے گویا تمام دُنیا کو زندگی بخشی

یہ وہ موقع ہے جہاں اسلام نے موسیٰ کی اس شریعت کا حکم دیا ہے کہ "جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ"

قرآن مجید نے ان دونوں مواقع کی تفریق وتمیز سے تورات وانجیل کی شریعت عفو وانتقام کی جو ناقص تھی، تکمیل کی، اور اس طرح وہ پورا ہوا جو (مسیح) نے کہا تھا کہ "میرے بعد آنے والا میری ادھوری باتوں کو پورا کردے گا"

اخلاق اور قانون

مسئلہ عفو وانتقام کی نسبت ایک اور نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔

دنیا میں دو چیزیں ہیں :- اخلاق اور قانون۔ اخلاق کا تعلق انسان کی ذات سے اور قانون کا تعلق حکومت اور مجتمع انسانی سے ہے، عفو و درگذر اور صفح و مغفرت ایک انسان کا بہترین وصف ہے، لیکن اگر اُس سے تجاوز کر کے وہ حکومت اور جمعیت انسانی تک پہونچ گیا تو وہ قانون کی سرحد میں آگیا

جہاں مغفرت گناہِ عظیم، اور صفح و عفو جریمۂ کبیرہ ہے۔ یہ جرأت آموز جرائم ہوتا ہے اور برہم زن امن انسانی۔

اسی لئے اُس ارحم الراحمین نے فرمایا، جہاں اپنے معجزانہ انداز کلام میں فرمایا کہ

ولکم فی القصاص حیوٰۃ یا اولی الالباب (۲-۱۷۹) اے دانشمندو! نوع انسانی کی بقا و حفاظت قصاص اور بدلے ہی میں ہے۔

گذشتہ آیت کو پھر پڑھو:۔

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا، ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا (۵-۳۲) جس نے کسی کو بغیر اسکے کہ وہ مرتکب قتل ہوا ہو، یا اُس نے زمین میں فساد برپا کیا ہو قتل کر دیا تو اُس نے گویا تمام دنیا کو قتل کیا، اور جس نے ایک کو زندہ بچایا۔ اُس نے گویا تمام دنیا کو زندگی بخشی!

اس موقعہ پر اگر قارئین کرام اُس سلسلۂ مقالات پر بھی ایک نظر ڈال لیں، جو (الہلال) جلد اول میں "امر بالمعروف" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، تو مطالب زیادہ وضاحت کے ساتھ ذہن نشین ہوں۔

اسلام دونوں کا جامع ہے

مسیحؑ کی تعلیم صرف اخلاق ہے اور موسیٰؑ کی شریعت صرف قانون، لیکن وہ جس نے کہا کہ "میں خانۂ نبوّت کی آخری اینٹ ہوں" [1] وہ جس طرح معلم اخلاق تھا، اُسی طرح ایک مقنن آئین و قانون بھی تھا۔ اُس نے کہا:۔

---

[1] آں حضرتؐ نے ایک تمثیل میں اپنے آپ کو (کہ تکمیل دین کے لئے تشریف لائے تھے) مکان کی آخری اینٹ سے تشبیہ دی ہے۔ جس کے بعد مکان کی عمارت کامل ہو جاتی ہے۔

والذین اذا اصابھم البغی ھم ینتصرون	خدا کے پاس کی وہ اُجرت جو سراسر خیر اور دائمی
وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا، فمن عفا	ہے، اُن لوگوں کے لئے ہے جو اُس سرکشی و بغاوت
واصلح فاجرہ علی اللہ، ان اللہ لایحب	کا، جو اُن کے ساتھ کی جائے، انتقام لیتے ہیں
الظالمین، ولمن انتصر بعد ظلمہ	کہ بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی ہے۔ البتہ جو معاف
فاولئک ما علیھم من سبیل، انما	کردے اور صلح کرلے تو اسکا اجر خدا پر ہے، وہ
السبیل علی الذین یظلمون الناس	ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔ جو اپنی مظلومی کے
ویبغون فی الارض بغیر الحق، اولئک	بعد اپنے ظلم کا انتقام لے تو اُس پر بھی کوئی الزام
لھم عذاب الیم، ولمن صبر وغفر	نہیں۔ الزام تو انھیں پر ہے جو خود لوگوں پر ظلم
ان ذالک لمن عزم الامور۔ (۴۲-۴۰)	کرتے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ یہی لوگ

ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے مگر جو صبر کرے اور دوسروں کی خطائیں بخشدے تو یہ بڑی ہی عالی حوصلگی کے کام ہیں۔

اسلام اور شرائع سابقہ کا یہ فرق ایک نہایت اہم اور اصولی نکتۂ دقیق ہے، اور افسوس کہ اسکی تشریح ضمناً ممکن نہیں، اور مصیبت یہ ہے کہ ایک موضوع پر لکھتے ہوئے کتنے ہی ضمنی مطالب کی طرف اشارہ کرنا پڑتا ہے۔

حاصل مبحث

ان تمام آیات میں بار بار اعادہ ہوا ہے کہ شریعت حقۂ الٰہیہ نے خوں ریزی کو اکبر الجرائم اور قتل نفس کو معصیت کبریٰ قرار دیا ہے۔ تاہم بقائے حفظ سلامت عالم، وامنیت انسانی، وقیام عدل ونظام کے لئے دو وصف کے لوگوں کا خون بہانا نہ صرف جائز بلکہ ضروری والزم بھی بتلایا ہے:۔

(۱) ایک وہ جس نے کسی مظلوم انسان کا ناحق خون کیا اُس سے قصاص لیا جائیگا

کہ اسکے عمل بد سے دنیا محفوظ رہے اور اسکا اقدام خونیں متعدی نہو۔

(۲) دوسرا وہ، جو زمین کے امن و سلامتی کو برباد، اور قوموں کے سکون و راحت کو غارت کرتا ہے، جو انسانوں کے خون کی عزت نہیں کرتا، جس کا وجود دنیا کے لئے باعث مصائب و حوادث اور موجب برہمی صلح و سلام ہے، اور جو انسانوں کے قدرتی حقوق اور خدا کی بخشی ہوئی آزادی و خود مختاری کو غارت کرنا چاہتا ہے۔ وہ بھی قتل کیا جائے کہ فی الحقیقت اس کی موت دنیا کی زندگی ہے۔

ولکم فی القصاص حیٰوۃ یا اولی الباب۔ (۲-۱۷۹)　　دانشمندو! قصاص و انتقام کے خون ہی میں تمھاری زندگی کا سرچشمہ ہے۔

اور اسلام کا یہ قانون کس کو معلوم نہیں؟

وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا (۴۲-۴۰)　　اور بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی ہے جیسی کہ کی گئی۔

یہی اصل الاصول دنیا کے مادی قوانین اور عدالت کو بھی قرار دینا پڑا ہے، اور سیاست اخلاقی بھی اپنی تعلیم رحم و درگذر کو یہاں پہونچکر یک سر پھیلا دیتی ہے، وہی عدالت جو خوں ریزی کو جرم بتلاتی ہے، جب خوں ریزی کی جائے، تو اس کا انصاف خون ریزی ہی سے کرتی ہے، اور جس نے تلوار سے خون بہایا ہے اُس کو عدالت کے جلاد کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے، یا سولی کے تختے پر کھڑا کیا جاتا ہے!

اخلاق سے بھی اگر فتویٰ طلب کیا جائے تو وہ عدالت کا ساتھ دیگا۔

کیونکہ اس بارے میں اصل الاصول یہ ہے کہ "انسانی زندگی اور اس کے فطری حقوق کی حفاظت کی جائے"، رحم بھی اسی لئے ہے تاکہ کسی پر سختی کر کے اسکی حیات و حقوق طبعیہ کو گزند نہ پہونچایا جائے، درگذر اور عفو بھی اسی لئے ہے تاکہ انسانی زندگی کا احترام، اور انسانی حقوق حیات کا اعتراف کیا جائے لیکن

اگر اس عفو و درگذر، اس تعلیم حفظ نفس، اور عدم قتل وخوں ریزی سے خود وہی اصل الاصول خطرے میں پڑ جائے، جسکی بنا پر یہ تمام اصول قائم کئے گئے تھے، تو پھر اسکے سوا چارہ نہیں کہ جس طرح انسانی زندگی وحقوق کی حفاظت کیلئے منع قتل کی تعلیم دی جاتی تھی، ٹھیک ٹھیک اسی طرح انسانی زندگی اور حقوق کی حفاظت ہی کے لئے قتل وخوں ریزی کی بھی اجازت دی جائے۔

اخلاق کا واعظ کہتا ہے کہ "قتل مت کرو" اور عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ "قاتل کو پھانسی پر چڑھاؤ" دونوں کا مقصد ایک ہی ہے، اور ٹھیک ٹھیک ایک ہی درجے میں دونوں انسانی زندگی اور حقوق طبیعی کے محافظ ہیں۔ پہلا خون کے روکنے کے لئے ایسا کہتا ہے، تو دوسرے کا بھی فیصلہ خون ہی کی حفاظت کے لئے ہے۔

البتہ اس عالم کی ہر راہ پل صراط ہے، اور صراط مستقیم عدل و اعتدال کا نام ہے، پس اگر اخلاق کے واعظ نے تفریط کی، اور قانون وسیاست نے افراط، تو دونوں کی تعلیم نظام امن وعدل کو درہم برہم کر دے گی۔

کوہ (سینا) کے اعتکاف نشین نے مقدس تختیوں پر جو کچھ لکھا، اور (گلیل) کی گلیوں میں جس اخلاق کی منادی کی گئی، وہ دونوں نظام و قوام کے دو علیحدہ عنصر ضرور تھے، پر الگ الگ دنیا کے لئے بیکار تھے۔ ایک یکسر قانون تھا جو بقول یہودی انشاپرداز (پولوس) کے "صرف سزا ہی دے سکتا تھا پر بچا نہیں سکتا تھا" (۱) دوسرا اخلاق محض تھا، جو حسن وجمال میں تو دل فریب تھا، پر عمل ونظام کے لئے بالکل بے کار تھا۔ یہ دونوں عنصر الگ الگ دنیا کے دُکھ کے لئے نہ صرف بیکار ہی تھے، بلکہ اس کی بیماری کو اور زیادہ کرنے والے تھے۔

لیکن جب وہ دُنیا سے گیا "جسکا جانا ہی بہتر تھا تاکہ آنے والے کو جلد بھیجنے

کے لئے اپنے آسمانی باپ سے سفارش کرے‘‘ (۲) اور خداوند نے (طور) اور (زیتون) کے پہاڑوں کی جگہ (فاران) کی چوٹیوں سے اپنی ندا بلند کی، تو وہ آگیا جو موسیٰ کے قانون اور مسیح کے وعظ کو پورا کرنے والا تھا‘‘ اس نے ناقص کو کامل، اور ادھورے کو پورا کیا، اور اُن دونوں عنصروں کو، جو الگ الگ تھے، التسویہ و اعتدال کے ساتھ اس طرح ترکیب دیا کہ قانون کا عدل اور اخلاق کا رحم دونوں باہم مل گئے، اور مدنیت و نظام انسانی کا ایک مرکب صحیح و صالح پیدا ہو گیا۔

اس مرکب میں ”جزاء سیئة سیئة مثلها“ اور ولمن صبر وغفر ان ذلک لمن عزم الامور‘‘ دونوں عنصر موجود ہیں۔

یہی شریعت حقۂ الٰہیہ ہے، یہی ناموس طبیعی و سنۃ ربانی ہے، یہی فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیها ہے، اور اگر ایک لمحہ، ایک دقیقہ کے لئے بھی اسکی حکومت دُنیا سے اُٹھ جائے اور صرف (توراۃ) کی قساوت یا صرف (انجیل) کی محبت دنیا پر مسلط ہو جائے، تو دونوں حالتوں میں دُنیا امن و مدنیت کی جگہ، قتل و خوں ریزی، نہب و سلب، وحشت و سبعیت، اور جرائم و معاصی کا ایک شیطان کدہ بن جائے!!

آخری نتیجہ

آخری نتیجہ جو ان مواد و ترتیبات کے بعد سامنے آتا ہے، یہ ہے کہ شریعت الٰہیہ نفس انسانی کی محافظ ہے، اور اسی لئے وہ دو صورتوں میں (حسب التصریح بالا) قتل نفس کو فرض و الزام قرار دیتی ہے۔ ان صورتوں میں انسانوں کا قاتل مجرم و عاصی نہیں ہوتا، بلکہ ایک نہایت مقدس فرض انسانیت و عدالت حقہ

انجام دینے والا ہوتا ہے، وہ ویسا ہی محب انسانیت اور نوع خواہ و امن پرست ہے، جیسا کہ خود قانون اور عدالت کی قوت، اس کا اخلاقی عمل نہایت اقدس و محترم ہے، کیونکہ وہ اس قتل نفس کے ذریعہ تمام جمعیت انسانی اور عدل و نظام امنیت کی خدمت انجام دیتا ہے۔

دنیا کا قانون اور اخلاق، دونوں شریعت الٰہیہ کے اس اصول و حکم کے قولاً و عملاً، دونوں طرح پیرو ہیں، گو بعض اوقات اپنے قول و عمل کو بھول جائیں۔

عود الی المقصود

پس اسی لئے تھا کہ حضرت (موسیٰ) علیہ السلام نے مصر کے بازار میں ایک قبطی پر ہاتھ اٹھایا، اور وہ مر گیا۔ اسکا قصہ "قصص بنی اسرائیل" کے سلسلے میں قرآن کریم نے بیان کیا ہے، اور یہ آج کی تمہید طویل اسلئے تھی تاکہ کل اس واقعہ پر ایک غائر نظر ڈال سکیں، اور پہلے ایک اصول قانون و فیصلہ اخلاق و شریعت ذہن نشین ہو جائے۔



خلافت کی کامیابی اور ہندوستان کی آزادی

کے لئے حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ جلد طلب کیجئے ورنہ گورنمنٹ کے دست تشدد سے اور کتابوں کی طرح ان کتابوں سے بھی آپ محروم رہجاویں گے۔

نام کتاب	قیمت
تصانیف مولانا محمد علی صاحب	
تقاریر محمد علی صاحب حصہ اول	۸ر
〃 〃 حصہ دوم	۸ر
خطبہ مولانا محمد علی صاحب	۵ر
تقریر مدراس	۳ر
جذبات جوہر	۰۲ر
بیان کراچی	۴ر
خطوط جیل علی برادران	۲ر
مضامین لالہ لاجپت رائے	
مجموعہ مضامین لالہ لاجپت رائے حصہ اول	۸ر
〃 〃 حصہ دوم	۸ر
غلامی کی علامتیں اور غلامی کے نتائج	۳ر
قومی تعلیم	۳ر
پالٹکس	۴ر

نام کتاب	قیمت
تصانیف مولانا عبدالماجد صاحب	
درس خلافت	۸ر
الاظہار	۸ر
المکتوب	۸ر
متفرق اصحاب	
تقاریر ظفر علی خاں	۹ر
اسیر مالٹا کا پیغام	۹ر
دنیائے اسلام اور خلافت	۴ر
سمرنا کی خونی داستان	۳ر
مقدمہ کراچی مکمل	۲عہ
خطبہ مولانا آزاد سبحانی	۶ر
جذبات حریت بہترین مجموعہ نظم	۸ر
مضامین مہاتما گاندھی جی حصہ اول	۱۰ر
〃 سوراج	۸ر

احمد آباد کانگریس مسلم لیگ۔ خلافت کانفرنس۔ سٹوڈنٹ کانفرنس وغیرہ کے مفصل حالات مرقعہ اجتماعات احمد آباد میں دیکھئے جس میں مولانا حسرت موہانی کا مشہور خطبہ صدارت بھی درج ہے ۱۰ر

مشتاق احمد ناظم قومی دار الاشاعت محلہ کوٹلہ شہر میرٹھ

